حیدرقریشی فن اور شخصیت

مرتبین

نذیر فتح پوری
سنجے گوڑ بولے

ناشر

''اسباق'' پبلی کیشنز۔ پُونہ

کتاب:۔۔۔۔حیدرقریشی فن اور شخصیت

مرتّبین :۔نذیر فتح پوری۔ سنجے گوڑ بولے

سن اشاعت:۔۔۔۔۔۔۔اپریل۲۰۰۲ء

چھپائی:۔۔۔۔۔۔ پربھات پریس۔پُونہ

ناشر:اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ

رابطہ:

۱۔اسباق پبلی کیشنز۔سائرہ منزل۱۰۲/بی/۲۳۰

وِمان درشن۔سنجے پارک۔لوہ گاؤں روڈ۔پُونہ

پن کوڈ:۴۱۱۰۳۲

۲۔ارشاد ہاشمی جوائنٹ ایڈیٹر ڈیلی اوصاف یورپ ایڈیشن

Roemerstr.65,

55413Trechtingshausen,Germany.

۳۔سعید شباب۔نایاب پبلی کیشنز

ایف/۱۸۳محلّہ کھوکھراں۔خان پور(ضلع رحیم یار خان)

پاکستان

انتساب

حیدرقریشی کے والدمحترم

قریشی غلام سرور صاحب مرحوم کے نام

جو حیدرقریشی کی تخلیقات میں آج
بھی زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں
اور جن کے خوابوں کی تعبیر
حیدرقریشی کی ادبی زندگی کے رُوپ میں موجود ہے

’’میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ابا جی نے یکے بعد دیگرے دوخواب دیکھے تھے۔ پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ابا جی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔یہ خواب سُن کر ابا جی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ’’حیدر۔۔۔حیدر‘‘ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ابا جی نے اپنے مُرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرما دیں۔ مُرشد کو ابا جی کے خواب کا علم نہیں تھا۔انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔‘‘

(حیدرقریشی کے خاکہ ’’برگد کا پیڑ‘‘ سے ایک اقتباس
بحوالہ ’’میری محبتیں‘‘ صفحہ نمبر۱۵)

فہرست

خاکے:

انٹرویوز:

بابِ شاعری:

بابِ افسانہ:

بابِ محبت:

بابِ تخلیق:

حیدر قریشی کی تخلیقات۔۔۔انتخاب وترتیب: سنجے گوڑ بولے

☆ **اقتباسات**: ممتاز مفتی، وزیر آغا، مجروح سلطانپوری، گیان چند جین، جیلانی کامران، انور سدید، مظہر امام، اکبر حمیدی، دیوندر اِسّر، ستار طاہر، قیصر تمکین، فہیم اعظمی، ہارون الرشید، رضیہ حامد، ترنم ریاض، سلطانہ مہر، نجمہ منصور، ش۔صغیر ادیب، نیاز احمد صوفی، محمد وسیم انجم (اقتباسات کتاب کے مختلف صفحات پر درج کئے گئے ہیں)

☆ **منظوم خراجِ تحسین** ناوک حمزہ پوری، اجمل جنڈیالوی، امین خیال، علقمہ شبلی، نذیر فتح پوری، ۱۸۹، ۱۹۲

گفت باہمی

پوچھتے ہیں وہ کہ حیدر کون ہے؟

نذیر فتح پوری

حیدر قریشی سے میرا قلمی تعارف غالباً ۱۹۹۰ء میں ہوا جب وہ کچھ مہینوں کے لئے دہلی میں مقیم تھے۔ ابتدا حیدر قریشی کی طرف سے ہوئی تھی (اور انتہا میں کرنے جا رہا ہوں)۔ سبب اردو ماہیے کا دوسرا مصرعہ۔ اُن دنوں ''سہیل'' گیا، ''انقلاب''، ''ممبئی اور ''بے باک'' مالیگاؤں میں میرے ماہیے کثرت سے شائع ہوئے تھے۔ تب تک اردو ماہیے کے دوسرے مصرع میں ایک سبب کم کرنے کی بات ہندوستان میں رائج نہیں ہوئی تھی۔ حیدر قریشی نے اپنے پہلے خط میں اسی جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ دوسرے یا تیسرے خط میں انہوں نے مجھے اپنا ایک غیر مطبوعہ مضمون بھی ارسال کیا جس کا عنوان تھا ''ماہیا اور اس کا دوسرا مصرعہ''۔ میں چونکہ بنیادی طور پر تخلیقی ذہن کا آدمی ہوں۔ بحر و وزن کے چکّر میں پڑے بغیر براہِ راست تخلیقی میدان میں اتر جاتا ہوں۔ مجھے حیدر قریشی کی بات میں ایک قسم کا ادبی چیلنج دکھائی دیا۔ میں نے اپنے پرانے ماہیوں کے دوسرے مصرعوں کو الٹ پلٹ کر حیدر قریشی کے بتائے ہوئے وزن پر مصرعے ڈھالنے شروع کر دیئے اور بہت جلد بہت سے ماہیے حیدر قریشی کو ارسال کر دیئے۔ حیدر قریشی کی جانب سے ماہیوں پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ اور پھر انہیں کی ایماء پر پہلی فرصت میں میں نے ''ریگِ رواں'' کے عنوان سے اپنے ماہیوں کا مسودہ تیار کر کے حیدر قریشی کو ارسال کر دیا جس کی اشاعت ۱۹۹۷ء میں امین خیال کی زیرنگرانی گوجرانوالہ پاکستان سے ہوئی۔ تب سے اب تک ہم دونوں کے درمیان ادبی رشتے مستحکم ہوتے چلے گئے۔

خوبیاں اور خامیاں ہر آدمی میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن میرے اور حیدر قریشی کے درمیان ہمیشہ خوبیوں ہی کا تبادلہ ہوا ہے۔ حیدر قریشی کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں کہیں اجنبیت یا خودغرضی کا عنصر دکھائی نہیں دیا۔ اتنے فاصلوں پر بیٹھ کر بھی وہ احباب کی خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں ماہیے کی تحریک چلانے

والے کچھ حضرات نے میرا نام دانستہ دوسری صف میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے لیکن حیدر قریشی نے اپنا موقف نہیں بدلا۔ انہوں نے ہمیشہ نذیر فتح پوری کو ماہیا نگاری کے اس عہد میں بھارت میں اردو ماہیے کہنے والا پہلا شاعر ہی لکھا۔

حیدر قریشی عمر کے لحاظ سے اگر چہ مجھ سے دو تین سال چھوٹے ہیں لیکن ادب کی دنیا میں ان کا نام اور کام بڑا ہے۔ وہ ایک فطری شاعر ہیں، باشعور نقاد ہیں، مسحور کر دینے والی نثر کے خالق ہیں۔ ان کی ذات کا عکس مرحوم سلیم احمد کے اس شعر میں اتر آیا ہے

ایک اک پتی میں گلشن ہے اسیر
ایک اک ذرّے میں صحرا بند ہے

اسی لئے حیدر قریشی ادب کے نگار خانے میں جس تس کا منہ نہیں تکتے اور آئینے کو حیرتی ہونے سے ہمیشہ بچائے رکھتے ہیں۔ ان کا اپنا ادبی نگار خانہ ہے جس میں انہوں نے اپنے مزاج اور معیار کے مطابق آئینے سجا رکھے ہیں۔ ان آئینوں میں وہ اپنی فطری ہنرمندیوں اور خداداد تخلیقی قوتوں کے عکس ابھارتے رہتے ہیں۔

کتاب ''حیدر قریشی۔۔۔ فن اور شخصیت'' نہ تو حیدر قریشی کے فن کا محاسبہ ہے، نہ محاکمہ۔ بلکہ یہ ان کے طویل ادبی سفر کی کامیابیوں پر ایک محبت بھرا خراج ہے۔ چاہتوں کا گلدستہ ہے۔ ان کی ادبی کامرانیوں کا اعتراف ہے۔ حیدر قریشی ان دنوں ادبی طور پر بالکل خاموش سے ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کی تخلیقی خاموشی کو توڑا جائے۔ میں ان کی خاموشی کی وجوہات میں نہیں جانا چاہتا۔ بس انہیں اتنا بتلانا چاہتا ہوں کہ ادب میں ان کا اتنا زیادہ حصہ ہے کہ ان کی خاموشی کے باوجود اس پر دیر تک کام ہوتا رہے گا۔ اسی کتاب کو دیکھ لیں اپنی پوری تگ و دو کے باوجود ان کی تمام اصناف میں کارکردگی کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ یوں حیدر قریشی پر ابھی مزید کتابیں ترتیب دیئے جانے اور لکھے جانے کی گنجائش ہے۔ اس لئے وہ سوچیں کہ کہیں ان کی تخلیقی محاذ پر خاموشی خدا کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کی نعمت کا کفران تو نہیں؟

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے حیدر قریشی کی خاموشی ٹوٹے گی۔ برف پگھلے گی اور ضرور پگھلے گی۔

ہم ان تمام اہلِ قلم کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہماری خواہش کے احترام میں بلکہ ہماری خواہش کی تائید میں حیدر قریشی کے فکر و فن کے بعض پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین لکھ کر ہمارے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ خصوصاً علاّمہ شارق جمال، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر محبوب راہی، خاور اعجاز، قاضی مشتاق احمد اور ڈاکٹر نجمہ رحمانی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے تعاون کے بغیر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

کچھ اپنی طرف سے

سنجے گوڑ بولے

کبھی کبھی زندگی میں عجیب وغریب اتفاق ہو جایا کرتے ہیں۔ میری زندگی بھی اس سے عبارت ہے۔ میری زندگی کی کہانی میں دوستوں اور ملاقاتیوں کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جو عالمی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک نئی کڑی جرمنی میں مقیم حیدر قریشی کی ذات بھی ہے۔ عالمی سطح پر مجھے اردو کے شعراء اور دنشوروں سے متعارف کرانے کا سہرا نذیر فتح پوری کے سر جاتا ہے۔ صرف ایک، ڈیڑھ سال قبل مجھے نذیر صاحب نے حیدر قریشی سے ملوایا۔ ان سے ملتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے ایک پرانے بچھڑے ہوئے دوست سے مل گیا ہوں۔ حیدر قریشی واقعی کمال کے آدمی ہیں۔ تندرست و توانا، چاق و چوبند، رواں دواں۔۔۔ اگرچہ ان سے ابھی تک دوبدو ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن کبھی ٹیلی فون پر، کبھی ای میل سے اور کبھی ڈاک کے ذریعہ ان سے تعلق بنا رہتا ہے۔ اور یہ تعلق اب اس حد تک آ گیا ہے کہ میں کتاب ''حیدر قریشی فن اور شخصیت'' کے دو مرتبین میں شامل ہوں۔ یہ کتاب حیدر قریشی کو دو دوستوں کی طرف سے ایک ادبی تحفہ کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ حیدر قریشی جرمنی میں بیٹھ کر اردو کے ادبی سماج کو اپنی محبتوں کی خوشبو بانٹ رہے ہیں۔ اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام کے ذہنوں اور دلوں تک پہنچ رہے ہیں۔ کبھی غزل، کبھی نظم، کبھی ماهیا اور کبھی اپنی محو کر دینے والی نثر کے وسیلے سے وہ اپنی بھرپور شرکت کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ مجھے حیدر قریشی کا رسمی تعارف دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اردو سماج ان کے نام اور کام سے بخوبی واقف ہے۔ اردو کے متعدد رسائل میں ان کی موجودگی، ان کی اپنی مختلف النوع کتابیں اور اردو ماهیے کے فروغ میں ان کا اہم کردار، ان میں کوئی چیز بھولنے والی نہیں۔ سارا کام ایک روشن آئینے کی مثال ہے۔ جدید عہد میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حیدر قریشی اس میدان میں پہلی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ہر اہم ویب سائٹ پر حیدر قریشی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ آپ

ان تینوں ویب سائٹس پر تو حیدر قریشی کو جہاں تہاں موجود دیکھیں گے۔ ان کے علاوہ ''اردو مرکز ڈاٹ کام'' سے لے کر ''اردو گھر ڈاٹ کام'' تک ہر جگہ حیدر قریشی کا کام دکھائی دے گا۔ آج اردو ماهیا انٹرنیٹ پر اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے تو اسے حیدر قریشی کا کام ہی سمجھیں۔ حیدر قریشی اپنی تخلیقات کو جتنی اہمیت دیتے ہیں اتنی ہی اہمیت وہ دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو دیتے ہیں۔ انٹرنیٹ اور اردو سماج کے بیچ حیدر قریشی رابطہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔ یہ کڑی اپنے آپ میں بے حد اہم ہے۔ میرے استاد ماہر غالبیات آنجہانی علامہ کالی داس گپتا رِضا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: ''میں پنجابی ہوں۔ نذیر فتح پوری راجستھانی ہیں اور تم مراٹھی ہو۔ ہم میں سے کسی کی مادری زبان اردو نہیں لیکن ہم تینوں ہی اردو کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں''

حیدر قریشی نسلاً سرائیکی ہیں لیکن ان کی مادری زبان پنجابی ہے۔ رضا صاحب کے چلے جانے کے ہمارا جو مثلث ٹوٹ گیا تھا، حیدر قریشی کی شمولیت سے وہ پھر جُڑ گیا ہے۔ اس تعلق کی پہلی منزل ''حیدر قریشی فن اور شخصیت'' کے رُوپ میں آپ کے سامنے ہے۔

میں حیدر قریشی کی شاعری پر مراٹھی میں لکھنا چاہتا ہوں۔ مراٹھی عوام کو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں اردو میں ایک ایسا شاعر بھی موجود ہے جس پر عشق کا فرشتہ شاعری اتارتا ہے:

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدؔر
مجھ پہ جو شاعری اتارتا ہے

میں اپنی مراٹھی دنیا کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ حیدر قریشی چولستان کی دھرتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خانپور کی شوگر مل میں ۱۹ سال تک ملازمت کی۔ پاکستان انٹرنیشنل پبلک اسکول اینڈ کالج (ایبٹ آباد) کے طلبہ کو اردو کا درس بھی دیا۔ اور اس کے بعد بھارت یاترا کرتے ہوئے جرمنی جا بسے۔ جرمنی کے ایک قصبہ ہیٹرس ہائم میں ان کا قیام ہے۔ جہاں بیٹھ کر وہ اردو ادب کا نیٹ ورک چلاتے ہیں۔ ''اردو ورلڈ انٹرنیشنل'' جرمنی کے وہ چیئرمین ہیں۔ ادبی رسالہ ''جدید ادب'' کے مدیر ہیں۔ تخلیقی طور پر زندگی سے جُڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کے گیت گاتے ہیں۔ شعر و نغمہ کی برسات کرتے ہیں۔ ادبی نثر میں افسانوں، خاکوں، انشائیوں، یادوں اور سفرنامے کی خوشبو پھیلاتے ہیں۔ اور اردو ماهیے کی عالمی حیثیت کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ میں یہ سب اپنی مراٹھی دنیا کو بتاؤں گا لیکن ابھی یہ کتاب پیش کرتے ہوئے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ حیدر قریشی کا دل، ان کا فن، ان کے جذبات، ان کا خلوص، ہمیشہ جوان رہیں اور ایک دن وہ اپنی محبتوں کے توسط سے ادب کے ''فاتح عالم'' بن جائیں!

ادبی کوائف حیدر قریشی

اصل نام: قریشی غلام حیدر ارشد

قلمی نام: حیدر قریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور صاحب

تاریخ پیدائش: سرکاری دستاویزات کے مطابق یکم ستمبر ۱۹۵۳ء ہے ۔

جبکہ درست خاندانی روایت کے مطابق: ۱۳رجنوری ۱۹۵۲ء

آبائی علاقہ: رحیم یار خاں ٗخان پور (سابق ریاست بھاولپور، جو اَب پنجاب میں شامل ہے)

تعلیم: ایم اے (اردو۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے۔ بحیثیت پرائیویٹ امیدوار)

ادبی سفر: ۱۹۷۱ء میں آغاز کیا۔

اصنافِ ادب: **شاعری میں**۔ غزل گوئی، نظم نگاری، ماہیا نگاری

نثر میں: افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، سفر نامہ نگاری، یادنگاری، تحقیق وتنقید نگاری

مطبوعہ کتب: شاعری: سلگتے خواب (غزلیں)، عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے)،

محبت کے پھول (ماہیے)، دعائے دل (غزلیں، نظمیں)

چاروں مجموعوں کا مجموعہ غزلیں، نظمیں، ماہیے

تخلیقی نثر: روشنی کی بشارت (افسانے)، قصے کہانیاں (افسانے)

افسانے (دونوں مجموعے ایک جلد میں)، ایٹمی جنگ (تین افسانے اردو اور ہندی میں)

میں انتظار کرتا ہوں (افسانوں کا ہندی ترجمہ)

میری محبتیں (خاکے)، سُوئے حجاز (سفرنامہ)، فاصلے قربتیں (انشائیے)

افسانے، خاکے، انشائیے (چار کتابیں ایک جلد میں)

کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری۔ دس قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔ کتاب زیرِ اشاعت ہے)

تحقیق وتنقید: ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین)، اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق وتنقید)

اردو ماہیے کی تحریک (مضامین)، اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین)

تحقیق وتنقید کی تین مزید کتب اور شاعری ونثر کی دو کتابوں کا میٹر بھی مکمل ہے۔

ادارت: ادبی رسالہ ''جدید ادب'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔ یہی جریدہ پھر جرمنی سے جاری کیا لیکن ابھی اس کی اشاعت معطل ہے۔

ماہانہ ادبی خبر نامہ ''اردو دنیا'' جرمنی کے ادبی پینل کے چیئر مین کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔

اردو کی متعدد ویب سائٹس سے کسی نہ کسی رنگ میں منسلک ہیں۔

ان کی کتابوں کے مکمل متن پر مشتمل ان کی ویب سائٹ زیرِ تکمیل ہے۔ www.haiderqureshi.com کے نام سے بننے والی اس سائٹ کو ان کے تین قریبی دوست خورشید اقبال (اردو دوست ڈاٹ کام)، نذر خلیق اور سعید شباب مل کر مکمل کر رہے ہیں۔

حیدر قریشی کے بارے میں ہونے والا ادبی کام:

۱۔ گوشہء حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ ''اسباق'' پونہ شمارہ: فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء

۲۔ اشاعتِ خصوصی ''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ ؍ حیدر قریشی'' ہفت روزہ ہوٹل ٹائمز اسلام آباد ۲۲ مئی تا ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء

مرتبین: اختر رضا کیکوٹی ومحمد وسیم انجم

۳۔ ''حیدر قریشی فکر وفن'' مصنف محمد وسیم انجم

۴۔ گوشہء حیدر قریشی مطبوعہ سہ ماہی ''ادبِ عالیہ'' وہاڑی۔ شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء

۵۔ ''حیدر قریشی فن اور شخصیت'' مرتبین نذیر فتح پوری و سنجے گوڑ بولے

☆ ایک اطلاع کے مطابق نذر خلیق حیدر قریشی کے فن سے متعلق ایک اہم کتاب مرتب کر رہے ہیں۔

موجودہ پتہ: Rossertstr.6,
65795 Hattersheim,
Germany.

خاکہ

گرم دمِ جستجو، گرم دم گفتگو

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

حیدرقریشی کا خاکہ شروع کرنے سے پہلے میں آپ کو اپنا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں بڑی سنجیدگی سے۔

میں ہوں کہ ابھی شست بدلنے نہیں پاتا

اور شاخ بدل جاتا ہے منظر کا پرندہ

بات یہ ہے کہ اس شعر میں جس پرندے کا ذکر ہے وہ دراصل حیدرقریشی ہے جو شاخ اتنی آسانی سے بدل جاتا ہے جتنی آسانی سے آپ اپنا لباس بدل جاتے ہیں۔ شاخ بدلنے کی صلاحیت کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ ایسا پرندہ کسی شکاری کا شکار نہیں ہوتا تاہم حیدرقریشی شاخ اس لیے نہیں بدلتا کہ شکاری سے بچا رہے بلکہ اس لئے بدلتا ہے کہ شاخ بدلنا اس کے مزاج کا حصہ ہے ورنہ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ شکاری تیر پر تیر چلائے جا رہا ہے اور حیدرقریشی شاخ بدلنے کا مزاج رکھتے ہوئے بھی سینہ تانے عین ہدف کے سامنے بیٹھا ہے کہ ایسی صورت حال میں شاخ بدلنا جان بچانے کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔

حیدرقریشی پر خاکہ لکھنا خاصا خطرناک ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ جب تک میں اس مضمون کے ذریعے اس کی طرف شست باندھوں وہ پھر سے شاخ تبدیل کر چکا ہو اور میرا تیر حیدرقریشی کے آس پاس سے ہو کر نکل جائے۔ معزز قارئین میرے شست باندھنے کی صلاحیت کو مورد الزام ٹھہراتے رہیں۔ حالانکہ داد حیدرقریشی کو ملنی چاہیے۔

حیدرقریشی نے ویسے تو مجھے پہلی ہی ملاقات میں چونکا دیا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ چونکانا اس کی عادت میں شامل ہے۔ ہوا یوں کہ میری اور اس کی ملاقات ٹھہری تھی وہ میری قیام گاہ پر تشریف لایا تو مارے حیرت کے میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پتہ نہیں کیوں میں شروع ہی سے یہ سمجھے بیٹھا ہوں کہ بیس بائیس سال کی عمر میں کوئی نوجوان اتنا بالغ اور پارسا نہیں ہوسکتا کہ داڑھی رکھ لے خاص طور سے جب وہ شاعری بھی کرتا ہو۔ حیدرقریشی پہلی ملاقات میں مجھے انہی کوائف کے ساتھ ملا اور میں اسے دیکھ دیکھ کر ورطہء حیرت میں ڈوبتا رہا اور سوچتا رہا۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے

مسلسل علماء کی مسجع۔ مقفع داڑھیاں دیکھ کر آخر حیدرقریشی کی نثری نظم جیسی داڑھی دیکھی تو میرے اندر کے نقاد نے سر اٹھایا مگر قبل اس کے کہ میرا نقاد حیدرقریشی کی نثری نظم جیسی داڑھی میں سے نظم اور نثر الگ الگ کر دکھاتا میں نے آگے بڑھ کر نقاد کو ٹھنڈا پانی پیش کیا اور حیدرقریشی کو چائے کی پیالی۔ تب چائے کی پیالی میں سے ایک نیا حیدرقریشی طلوع ہوا۔ میٹھا، دل پذیر، جوتوں سمیت دل میں اتر جانے والا، صاف ستھرا، کھرا، دوٹوک، ٹوٹ کر محبت کرنے والا، مصلحتوں کی کمزوریوں سے مبرا، اپنی رائے اور فیصلے اور محبت میں اٹل، دوستوں کو آگے نکلتا دیکھ کر خوش ہونے والا۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ دشمنوں کا اپنے سے آگے نکلنا برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر دوستوں کو اپنے آپ سے آگے نکلتے دیکھ کر برداشت نہیں کر پاتے (Shareeka) شریکا اسی کو کہتے ہیں۔!!

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ شاخ بدلنا اور چونکانا حیدرقریشی کے مزاج کے حصے ہیں بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس تیزی سے شاخ بدلنا بھی چونکانے کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے مگر چونکانے کے لیے کتنی ذہانت کی اور کتنی قوت کی ضرورت ہے یہ محتاج بیان نہیں۔ چونکانے کا عمل تو ایک خاموش دھماکے کا عمل ہے! یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ شاخ بدلنا سے میری مراد روایات، آبائی خیالات اور فرسودہ موقف کو ترک کر سکنے کی قوت ہے۔ بقول غالبؔ

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرو

اس طرح چونکانے والا بھی ایک غیر معمولی آدمی ہوتا ہے۔ حیدرقریشی بھی اپنے تمام معاملات میں غیر معمولی ہے۔ میں اسے انتہا پسند نہیں کہوں گا۔ کیونکہ انتہا پسندی کی ایک مقبول زمانہ شکل حریت پسندی ہے۔ امید واثق ہے کہ آگے چل کر حیدرقریشی کے خاندان میں سے کوئی حریت پسند بھی ابھرے گا اور وہی زمانہ آزادی۔۔۔ کا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حیدرقریشی نے اپنے ایک بیٹے کا نام ٹیپو رکھ دیا ہے۔

حیدرقریشی میں کوئی مقناطیسی قوت ضرور ہے کہ جو کوئی ایک بار اس کے حلقہ احباب میں داخل ہوا پھر کبھی باہر نہ نکلا میں اور فرحت نواز تو خیر اب اس زنجیر کے عادی ہو چکے ہیں حیرت تو یہ ہے کہ یہ زنجیر محبت بہت سے نئے شاعروں اور شاعرات کو گرفتار کرتی چلی جا رہی ہے۔ سنا ہے ایک مرتبہ یہ زنجیر غلام جیلانی اصغر کو بھی گرفت کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ مگر جیلانی صاحب اپنے زوردار جملوں کے ذریعے رہائی پانے میں کامیاب ہو گئے اس جملے سے آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے جیلانی صاحب کو نئے شاعروں میں (شاعرات میں تو ہرگز نہیں) شامل کر لیا ہے حالانکہ جیلانی صاحب کی یہ انتہائی خواہش ہے۔ حیدرقریشی کے دوستوں اور ادبی احباب میں ڈاکٹر وزیر آغا،

ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر انور سدید، محمد علی صدیقی جوگندر پال اور فرحت نواز جیسے نامور لوگ بھی شامل ہیں اور تازہ واردان بساطِ ادب بھی!

اس زمانے میں بہت سے لوگ دولت، منصب، کسی منفعت بخش محکمے کی نوکری، ادارت، خاندان، ادبی غنڈہ گردی، پی آر، خوشامد (اصل میں دونوں ایک ہیں) اپنے بڑے شہر، موزوں ماحول، حلقہ احباب، اور ایسی ہی غیر ادبی سرگرمیوں کے ذریعے ادبی اہمیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں آج کے بہت سے مقبول و محبوب اہل قلم کے ہاتھ اگر کھڑے کرائے جائیں تو اکثر کی بغلوں میں سے اس قسم کے بت، بیساکھیاں (یہ بھی دونوں ایک ہیں) نکلیں گی اور ان کے نکلتے ہی ہمارے سبک رفتار اہل قلم دھڑام سے زمین پر آ رہیں گے۔ حیدر قریشی نے ان سب باتوں کے برعکس خانپور جیسے قصبے اور ادبی مرکز سے دور دراز کے علاقے سے اپنا علم بلند کیا اور آج یہ حالت ہے کہ ادیب، شاعر خانپور کو اس لئے جانتے ہیں کہ وہاں حیدر قریشی رہتا ہے اور وہاں سے اپنا رسالہ "جدید ادب" شائع کرتا ہے۔ وہی حیدر قرشی جو اپنا ادبی سفر اپنے تیز رفتار قدموں پر چل کر طے کر رہا ہے اور جس نے مختصر عرصے میں ادب میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے آج اس کا شمار برصغیر کے جانے پہچانے اور مقبول اہل قلم میں ہوتا ہے۔

حیدر قریشی گرم دم جستجو اور گرم دم گفتگو قسم کا آدمی ہے اتنا خود اعتماد کہ فاختہ ہوتے ہوئے بھی شہبازوں پر جھپٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے بلکہ سال میں دو ایک مرتبہ کسی نہ کسی شہباز پر جھپٹ جاتا ہے دوستوں کے بارے میں اس کا رویہ بڑا ہی خطرناک ہے۔ ہمہ یاراں جنت ہمہ یاراں دوزخ کا محاورہ آپ نے سنا ہوگا۔ حیدر قریشی جنت کا تو خواہش مند نظر نہیں آتا۔ البتہ وہ دوزخ کا بہت مشتاق دکھائی دیتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ اس کی وابستگی اتنی پختہ ہے کہ ہر جگہ دوستوں کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی پر حملہ آور ہو رہا ہے تو دوستوں کو بھی حملے میں شریک کرے گا۔ اگر شاخ بدل رہا ہے تو دوستوں کو بھی شاخ بدلنے کا اشارا دے گا۔ آپ جانتے ہیں خدا کے فضل سے میں پکا کافر ہوں اور حیدر قریشی بھی پختہ کافر ہے ایک بار اسے مزید کافر ہونے کا خیال آیا۔ چنانچہ اب وہ چاہتا تھا کہ اس "مزید" میں میں بھی شامل ہو جاؤں مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھے تاکہ دوستی کے رشتے میں کمی واقع نہ ہو۔ شاید اسی کو کہتے ہیں نہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی۔ مگر یارو! رفاقت کی اس قدر خواہش اور اس حد تک خواہش اب کتنے لوگوں کے دلوں میں ہے؟

وہ دوستوں ہی کو اپنے ساتھ نہیں رکھتا خود بھی دوستوں کے ساتھ رہتا ہے میرے انشائیوں کے مجموعے "جزیرے کا سفر" کی تقریب کی خبر جب اس نے سنی تو مجھے لکھا کہ میں اور فرحت نواز بھی اس تقریب میں مضمون پڑھنے خانپور

سے سرگودھا آ رہے ہیں ہمیں دعوت نامے بھجواؤ۔ چنانچہ دسمبر کی بارشوں میں وہ اور فرحت نواز دونوں اس تقریب کے لیے سرگودھا پہنچے۔ اسی طرح جب میرا تیسرا مجموعہ "تلوار اس کے ہاتھ" شائع ہو رہا تھا، حیدر قریشی نے مجھے لکھا۔ یہ مجموعہ مکتبہ جدید ادب شائع کرے گا۔ چنانچہ وہیں سے شائع ہوا۔ اب جبکہ "ریڈیو کالم" چھپنے لگے ہیں تو اس نے لکھا ہے "مسودہ مجھے بھیج دو"

اس خودغرض، سودا باز اور کم حوصلہ عہد میں اتنے بے غرض مخلص اور وسعت ظرف رکھنے والے دوست کہاں ملتے ہیں ویسے بھی میرا تجربہ ہے کہ بڑے شہر عام طور پر چھوٹے لوگوں کو پیدا کرتے ہیں۔ بڑے لوگ جو اندر سے بڑے ہوتے ہیں وہ تو چھوٹے شہروں کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی بھی چھوٹے شہر کا بڑا آدمی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ابھی اس کے بڑے پن کا سب کو علم نہیں ہے! کم علمی اسی کو تو کہتے ہیں۔ یہی بڑا پن اور وسعت اس کے عقائد و نظریات میں ہے۔ یہی اس کی محبتوں اور نفرتوں میں اور یہی وسعت اس کی شخصیت کے سب زاویوں میں جگمگاتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنے بڑے پن سے بھی مرعوب نہیں بعض لوگ اپنی شخصیت یا عظمت کے سحر میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنی شخصیت ان سے وہی سلوک کرتی ہے جو افریقہ کے جنگلات میں بعض درخت راہگیروں سے کرتے ہیں۔ یعنی انہیں اپنی کشش میں گرفتار کر لیتے اور پھر اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک پوری طرح ختم نہیں کر دیتے۔

حیدر قریشی اپنی شخصیت سے بقول کسے کئی قدم آگے رہتا ہے۔ گویا کششِ ثقل کے دائرے میں محصور نہیں۔ میں نے حیدر قریشی کو اپنے مضمون میں مقید اور منعکس کرنے کی کوشش تو کی ہے مگر مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہی اصلی تے وڈا حیدر قریشی ہے بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ اب تک وہ ایک بار پھر شاخ بدل چکا ہو۔

آپ نے شاید کبھی توجہ نہ دی ہو حیدر قریشی کو دیکھ کر میں نے اکثر صدائے کن فیکون سنی ہے۔

جب میں حیدر قریشی کو اس طرح تیز تیز چلتے دیکھتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دور کی منزل کا راہی ہے۔

(یہ خاکہ ''اسباق'' پونہ کے شمارہ فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا)

حیدر قریشی کی یلغار سے اب تک بہت کم اصناف ادب محفوظ رہ سکی ہیں۔ نظم، غزل، حمد، نعت، ماہیا، افسانہ، خاکہ، انشائیہ، تنقید، ایسا لگتا ہے کہ اصنافِ ادب اس کی راہ میں سر جھکائے کھڑی ہیں کہ وہ آئے اور انہیں شکار کر کے ان کی عزت و توقیر میں اضافہ کرے''۔۔۔۔۔ **اکبر حمیدی**

(اقتباس از مضمون ''محبت کے پھول کے ماہیے'' مطبوعہ دو ماہی ''گلبن'' احمد آباد ماہیا نمبر ۱۹۹۸ء)

لفظوں کا مسیحا

نذیر فتح پوری (پونہ)

کچھ لوگ محض مشکلیں پیدا کرنے کے لئے ہی عالَمِ وجود میں آتے ہیں، لیکن حیدر قریشی کی خوبی یہ ہے کہ وہ جتنی مشکلیں پیدا کرتے ہیں ان سے کہیں زیادہ ان مشکلوں کا حل بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ محض ادبی میدان ہی میں مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ادب بھی کس زبان کا؟ اردو زبان کا۔استاد ہُد ہُد گلشن آبادی فرماتے ہیں کہ اردو کے پرستاروں، جاں نثاروں اور تنخواہ خواروں کے طفیل اردو کے لئے پہلے ہی کیا مشکلیں کم تھیں کہ حیدر قریشی نے اس میں ماہیے کی دیوار کھڑی کر دی۔اتنا ہی نہیں بلکہ اپنی تائید و ہم رکابی کے لئے ایک لشکر تیار کر کے ادب کے عالمی میدان میں جنگ کا اعلان کر دیا۔لاکھ سمجھایا کہ بھائی! تخلیقی ادب کا سمندر ترقی پسندیت اور جدیدیت کے بعد تھک تھکا کر سویا ہے اسے کچھ دنوں تک آرام کی سخت ضرورت ہے۔ابھی ایک دہائی پہلے مظہر امام نے آزاد غزل کا پتھر مار کر اس خوابیدہ سمندر میں طوفان اٹھانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن کچھ دنوں تک موجیں اچھال کر سمندر پھر سو گیا۔آپ کیوں اس کی نیند توڑنا چاہتے ہیں؟ ویسے بھی گہری نیند سوئے کو جگانا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔لیکن وہ حیدر قریشی ہی کیا جو کسی کا نیک مشورہ مان لیں۔تعجب تو اس بات کا ہے کہ جن صاحب نے حیدر قریشی کو یہ نیک مشورہ دیا تھا کچھ دنوں کے بعد وہ بھی ماہیے کے میدان میں حیدر قریشی کے شانہ بشانہ برسرِ پیکار تھے۔

جب حیدر قریشی نے ادب کے میدان میں ماہیے کی دیوار کھڑی کی تو ''بے سمت و بے رفتار'' چلتے ذہنی رویوں کو ایک دھچکا سا لگا۔اچانک بریک لگنے سے دوڑتے بھاگتے قدم رُک گئے، انائیں مجروح ہو گئیں، رہنما احساس ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا، خود ساختہ کمندیں زمیں بوس ہو گئیں۔تب سبھی نے یک ذہن اور یک دست ہو کر دیوار کو ڈھانے کا عمل شروع کر دیا۔لیکن اس تخریبی عمل نے تمام ہاتھ زخمی کر دیئے۔اس طرح انگلیاں فگار نہ ہوئیں، لہولہان ہو گئیں۔خامے کی بجائے ہاتھوں سے خون ٹپکنے لگا اور احتجاجی چیخوں کا شور بلند ہونے لگا۔مخالف صفوں میں ماتم تو نہ ہوا لیکن ماتم کا سا احساس جاگنے لگا۔حیدر قریشی چونکہ اپنی عادت سے مجبور تھے، ان کو رحم آ گیا۔انہوں نے

مفعول مفاعیلن/فعل مفاعیلن/مفعول مفاعیلن کا وظیفہ پڑھ کر ایسا دَم مارا کہ دَمِ زدن میں خود ان کی تعمیر کردہ دیوار ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔یہ کوئی دیوارِ چین نہیں تھی، نہ ہی دیوارِ برلن تھی، یہ تو محض پانی کی دیوار تھی۔استاد ہد ہد گلشن آبادی فرماتے ہیں: ''پانی بھی وہ جو پنجاب کا ہے، پانچ دریاؤں کا ہے، جس کی ہر موج میں مستی ہے، زندگی کا سُکھ ہے، تخلیقی توانائی ہے، سُریلا پَن ہے، نغمگی ہے، ہجر و وصال کے قصے ہیں، حوصلے اور جوانمردی کی داستان ہے''۔استاد ہُد ہُد گلشن آبادی آگے فرماتے ہیں کہ: ''یہ داستان، داستانِ حاتم طائی کی پُر اسراریت سے کہیں زیادہ پُر اسرار ہے۔ایک کہانی میں بے شمار کہانیاں ہیں اور بے شمار کہانیوں میں بھی بے شمار کہانیاں پوشیدہ ہیں۔گزشتہ ایک دَہائی سے یہ کہانی ماہیے کی صورت میں دُہرائی جا رہی ہے لیکن اس کی پُر اسراریت ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ہر کہانی کی ابتدا حیدر قریشی کی ذات سے ہوتی ہے اور انتہا بھی حیدر قریشی ہی کی ذات پر ہوتی ہے۔اس دوران موقع محل کے لحاظ سے کہانیوں میں مختلف کردار شامل ہوتے ہیں۔ان میں نُوری بھی ہیں اور ناری بھی، جو اپنا اپنا مثبت اور منفی رول نبھا کر چلے جاتے ہیں۔حیدر قریشی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہیں، اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں، دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کے ہنر سے بھی وہ خوب واقف ہیں اور اپنا یہ ہنر دکھانے میں قطعی بخل سے کام نہیں لیتے۔منہ موڑ کر جانے والوں کے لئے ان کے دل میں دُکھ کے طوفان اُٹھتے ہیں۔وہ روٹھے ہوؤں کو منانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کوشش میں وہ فہم و ادراک کے سارے جھرنے بہا دیتے ہیں۔علم و ہنر کے سارے دروازے اور کھڑکیاں وا کر کے استقبال کے لئے خود ہی ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔جو جس دروازے سے آتا ہے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ میں روشن مستقبل کا ماہیا تھما کر اسے آگے کی صفوں میں بھیج دیتے ہیں اور خود پچھلی صف میں آ جاتے ہیں۔حیدر قریشی اس دانش کو جان چکے ہیں کہ جو آخری صف کا سپاہی ہوگا، کامیابی کے سارے ستارے اسی کے سینے پر سجائے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ حیدر قریشی کسی طلسماتی شخصیت کا نام ہے۔جہاں دیکھو وہاں موجود، جب سوچو تب حاضر، اردو کے بیشتر رسائل اور اخبارات پر وہ آسمان کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔جرمنی میں رہتے ہیں لیکن ادب کا ریموٹ کنٹرول ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جس کا استعمال وہ تخریب کے لئے ہرگز نہیں کرتے۔البتہ ماہیے کی تحریک میں رُکاوٹ پیدا کرنے والوں کو وہ اپنے ریموٹ کنٹرول سے خوفزدہ ضرور کرتے رہتے ہیں۔ریموٹ کنٹرول کے درست استعمال کو وہ ماہیے کے درست وزن کی تحریک کے ساتھ ساتھ چلاتے ہیں۔اپنی اس ہنرمندی کی داد پاتے ہیں اور دل ہی دل میں اس کا جشن مناتے ہیں۔تنہائی میں جشن منانے کی بھی اپنی ایک لذّت

ہے۔اس لذّت سے حیدرقریشی بخوبی واقف ہیں۔ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس کالم میں ہم حیدرقریشی کی ادبی زندگی کے کس کس روشن پہلو کو مزید روشن کریں۔جہاں چہار سمت اجالا ہی اجالا ہی ہو۔جہاں حرف چمکتے ہوں،لفظ دمکتے ہوں،وہاں خانہ بدوش کے چند بجھے ہوئے توصیفی جملوں کی کیا بساط کہ وہ کوئی کرن چمکا سکے۔ایسی جان لیوا گھڑیوں میں استاد ہُد ہُد گلشن آبادی مینارۂ نُور کی طرح ہمارے کام آتے ہیں۔ایسے میں ہم جب مراقب ہو کر استاد سے مخاطب ہوتے ہیں تو استاد ہماری رہنمائی کے لئے فوراً ہو جاتے ہیں اور اپنی نورانی دعاؤں سے ہمارے ذہن و قلم کو روشن کر دیتے ہیں۔آج بھی ایسا ہی کچھ ہوا اور ہم آگے کی سطور قلم بند کرنے کے قابل ہو گئے۔

آدمی ہر رُوپ میں جیتا ہے۔اس کے اندر خوب بھی ہوتا ہے اور ناخوب بھی۔زہر بھی ہوتا ہے اور امرت بھی۔روشنی بھی ہوتی ہے اور اندھیرا بھی۔علم بھی ہوتا ہے اور جہالت بھی۔کچھ لوگ عالم ہوتے ہوئے بھی جاہل ہوتے ہیں اور کچھ جاہل ہوتے ہوئے بھی عالم ہوتے ہیں۔لیکن حیدرقریشی عالم ہوتے ہوئے بھی عالم ہی ہیں۔اسی لئے تو خوب اور ناخوب کی دوڑ میں وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کرتے ہیں۔زہر کی پوٹلی کو دفنا کر امرت لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔اندھیرے،اجالے کی جنگ میں وہ اجالے کا مورچہ سنبھالتے ہیں۔مخولیوں کا جواب انتہائی نرمی سے دیتے ہیں،صرف زیرِ لب مسکرا کر۔۔۔لیکن اُس وقت ان کی مسکراہٹ مونا لیزا کی خیالی مسکراہٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ادبی دنیا میں حیدرقریشی مخزن الاسرار کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔کچھ لوگ انہیں مخزن العلوم بھی کہتے ہیں لیکن ہمارے استاد ہد ہد گلشن آبادی،حیدرقریشی کو ایک متقاطر شخصیت کا مالک تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

’’حیدرقریشی نے جب غزل کے میدان میں قدم رکھا تو اسے سیراب کر دیا۔جب نظم کے میدان میں برسے تو اتنا ٹوٹ کر برسے کہ چاروں طرف جل تھل کا منظر پیش کر دیا۔جب ماہیے کے کھیت میں مشقّت کی تو سال میں کئی کئی فصلیں کاٹیں اور جب افسانے کی جانب ملتفت ہوئے تو تخلیقی توانائی کے ایسے جھرنے بہائے کہ پانی ہی پانی دکھائی دینے لگا۔اس کے بعد انشائیے،خاکے،تبصرے،آپ بیتی،جگ بیتی،منفی اور مثبت تحریریں،خطوط،ہر سوال کا جواب،پھر جواب کا جواب۔قدرت نے تخلیقی اعتبار سے انہیں جن ادبی سوتوں کی محافظت کے لئے مامور کیا ہے وہ کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔‘‘(بحوالہ ’’ہد ہد نامہ‘‘ صفحہ نمبر ۱۱،مصنف ہد ہد گلشن آبادی)

کم کم لوگوں کو اپنی ذات کا عرفان ہوا کرتا ہے،حیدرقریشی اُن میں سے ایک ہیں۔غالب کی طرح وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کا مکمل درک رکھتے ہیں۔جو آدمی خود کو پہچان لیتا ہے وہ دوسروں کو پہچان لینے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حیدرقریشی پوری دنیا کو جان گئے ہیں لیکن انہوں نے جتنا کچھ جانا ہے پورے خلوص اور

ایمانداری کے ساتھ جانا ہے۔اتنا خلوص اور ایمانداری رکھنے والے پچھلے وقتوں میں ولی بن جایا کرتے تھے۔موجودہ دور چونکہ ولیوں کی نفی کا دور ہے اس لیے ہم اس عہدے پر حیدرقریشی جیسے ادبی شخص کو فائز کرنے کے حق میں نہیں ہیں ورنہ مخالفین کا ایک لشکر ہمارے مقابل ہو جائے گا۔

حیدرقریشی کی مختلف ادبی فتوحات پر مختلف صورتوں میں مختلف سمتوں سے داد و تحسین کے نعرے بلند کئے گئے۔یہاں تک کہ انہیں اردو ماہیے کا سرخیل لکھا اور کہا گیا۔بعض نے ان کی شان میں قصیدے بھی لکھے۔ماہیا نگاروں کی ایک ٹیم نے حیدرقریشی کی شخصیت کو موضوع بنا کر ماہیے تخلیق کئے۔ان کی کتابوں پر تبصروں اور توصیفی مضامین کا ایک دفتر بھر دیا گیا لیکن حیدرقریشی،حیدرقریشی ہی رہے۔اتنی ادبی مسرتیں حاصل کرنے کے باوجود ان کے ظرف کا پیمانہ چھلکنے کی جسارت نہ کر سکا۔نہ اُن کے قدم بہکے،نہ ان کی زبان چہکی۔وہ عجز و انکسار کا پیکر ہی بنے رہے۔یہاں ہمیں استاد ہد ہد گلشن آبادی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے

سب کو مارا تری محبت نے

اور تجھے انکسار نے مارا

انکساری کی طرح ان کی محبت کے انداز بھی نرالے ہیں۔وہ جسے اپنا بنا لیتے ہیں،اُس کی نیند اُڑا دیتے ہیں۔حیدرقریشی نہ خود آرام کرتے ہیں،نہ اپنے محبّ کو آرام کرنے دیتے ہیں۔ادبی تہجد گزاری ان کے مشن کا ایک حصہ ہے۔وہ کب کھاتے ہیں،کب پیتے ہیں،کب سوتے ہیں،کب چین کی بانسری بجاتے ہیں،اس تعلق سے کچھ کہنا محال ہے۔تحریر و ترسیل کا ایک جال انہوں نے اپنے اطراف پھیلا رکھا ہے۔کبوتروں کی جگہ ہوائی جہاز ان کے محبت ناموں کی ترسیل کی خدمت انجام دے کر سرخرو ہو رہے ہیں۔

ابھی ابھی حیدرقریشی کی تازہ ترین کتاب ’’اردو ماہیے کے بانی۔۔۔ہمت رائے شرما‘‘ موصول ہوئی ہے۔جرمنی میں بیٹھے بیٹھے موصوف نے ممبئی جیسے گنجان شہر میں کھوئے ہوئے ہمت رائے شرما جی کو دریافت کر کے نئی زندگی عطا کی ہے۔ہمت رائے شرما برسوں سے فالج کا شکار ہیں۔ممبئی کے فلمی اور ادبی حلقوں نے انہیں برسوں سے فراموش کر رکھا ہے۔ہم اسے حیدرقریشی کا مسیحانہ عمل قرار دیتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء سے فلمی دنیا میں نام کمانے والے شرما جی آج پھر قرطاس و قلم سے منسلک ہو گئے ہیں اور خوبصورت ماہیے کہہ رہے ہیں۔گویا حیدرقریشی کی مسیحائی نے ہمت رائے شرما جی کو تخلیقی طور پر پھر سے زندہ کر دیا ہے۔لفظوں کی یہ مسیحائی صرف حیدرقریشی کا ہی حصہ ہے۔

حیدرقریشی سے انٹرویو

از پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفرآباد۔کشمیر)

(نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی اپریل ۲۰۰۰ء کے اواخر میں جرمنی گئے تھے۔وھاں انھوں نے حیدر قریشی سے ایک انٹرویو کیا تھا۔یہ انٹرویو مئی/ ۲۰۰۰ء میں لیا گیا تھا۔)

سوال: آپ کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ وہاں کی کوئی یادیں؟

جواب: میرے بچپن اورلڑکپن کا بیشتر حصہ رحیم یارخاں اور خان پور میں گزرا۔چونکہ شروع میں ہمارا گھر خوشحال تھا اس لئے ابتدائی عرصہ تو بہت اچھا گزرا لیکن جب ابا جی کا کپڑے کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو ہماری تکالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ہم نے تنگ دستی کا ایک طویل زمانہ کاٹا۔اس کے باوجود بچپن ویسے ہی گزرا جیسے میرے معاشرے کے عام بچوں کا گزرتا ہے۔یادیں تو بے شمار ہیں۔انڈیا کے ادبی رسالہ ''گلبن'' احمدآباد میں میری یادیں قسط وار چھپ رہی ہیں۔اب تک سات قسطیں چھپ چکی ہیں۔میں ان یادوں کو اپنے ادبی رسالہ ''جدید ادب'' میں بھی چھاپنا شروع کر رہا ہوں۔سوان یادوں کو یا تو ان رسائل میں دیکھا جائے یا پھر میری کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے چھپنے کا انتظار کر لیں' کیونکہ ان یادوں کے بیان کے لئے تو آپ کے اس پورے انٹرویو کے صفحات ناکافی ہوں گے۔

سوال: ایبٹ آباد میں ملازمت اور قیام کا تجربہ کیسا رہا تھا؟

جواب: بے حد خوبصورت اور بے حد خوشگوار۔۔۔۔ایک تو مجھے ایک لمبے عرصہ کی بے روزگاری کے بعد ملازمت ملی تھی' پھر ملازمت درس وتدریس کی تھی۔جس ادارہ میں جاب ملی وہ ایک مستحکم ادارہ تھا۔پاکستان میں اس ملازمت کے بعد مجھے پہلی دفعہ آرام دہ زندگی کا احساس ہوا تھا۔میں آج بھی اس تعلیمی ادارہ کے سربراہ اعجاز اکبر صاحب کو دعائیں دیتا ہوں۔پھر صحرائی علاقہ کے بعد پہاڑی علاقے کے مظاہر فطرت سے میری شناسائی

ہوئی۔اس کے اچھے اثرات میری تخلیقات پر مرتب ہوئے۔

سوال: جرمنی میں زندگی کیسے گزر رہی ہے؟

جواب: اللہ کا کرم ہے۔یہاں آنے کے بعد جب زندگی کے بعض تفکرات سے چھٹکارا ملا تو مجھے بہتر طور پر ادبی اور تخلیقی کام کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔اور سارے کام کرنے کا مزہ بھی آرہا ہے۔''جدید ادب'' کو اب پھر سے ریگولر کرنے کا سوچ رہا ہوں۔تخلیقی طور پر فعال ہوا ہوں۔گزشتہ چھ برس کے عرصہ میں میرے تین شعری مجموعے' ایک مجموعہ خاکوں کا' ایک افسانوں کا' چھپ چکے ہیں۔تحقیق اور تنقید کی چار کتابیں چھپ چکی ہیں۔مزید اس وقت تنقید کی دو' انشائیوں کی ایک' ایک سفرنامہ' کوئی چار پانچ کتابیں زیر اشاعت ہیں اور دو تین زیر ترتیب ہیں۔میں مذاق میں کہا کرتا ہوں کہ جرمنی میں میری جاب اور میری فیملی میرے لئے ''پارٹ ٹائم'' ہیں جبکہ ادب میرے لئے فُل ٹائم ہے۔لیکن کبھی کبھی ایسے لگتا ہے جیسے یہ بات محض مذاق نہیں' واقعی سچ ہے۔بہرحال زندگی یہاں مزے مزے سے گزر رہی ہے۔

سوال: جرمنی میں آنے کے بعد آپ کی غزل میں کس قدر تبدیلی آئی ہے؟

جواب: ایک دوست نے مجھے لکھا کہ جرمنی جانے کے بعد آپ کی غزل میں اظہار بہت زیادہ کھلا ڈُلا ہوگیا ہے۔بات ان کی درست تھی۔ہجر کے لمبے زمانے کے بعد وصل کا موسم آئے تو اس کا اثر تو ظاہر ہوگا۔لیکن یہ بھی ہے کہ میری ابتدائی غزلوں میں بھی ایسے اشعار موجود تھے:

یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے

رات بھر وصل کا چاند چمکا کیا
دل سمندر ہمکتے رہے رات بھر

تمہارے ہی لئے ہیں دل کے جتنے مل سکیں ٹکڑے
تمہارے واسطے ہے تن پہ جتنا ماس باقی ہے

اور یہاں جرمنی آنے کے بعد میری غزل میں ایسے اشعار بھی ہوئے ہیں:

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے

قابو میں نہیں دل کہ حضوری کی گھڑی ہے

آج تو کھل کے ہنس دیئے حیدؔر
دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

جب اس نے خاک اڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کرلیا ہے

جرمن احسانات سبھی برحق حیدؔر
فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے

آج حیدؔر مُوڈ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کرلیا

اس کے باوجود بہرحال یورپ کے ماحول کی کشادگی کا اثر تو غزل پر آنا تھا سو آیا' لیکن صرف غزل پر ہی کیوں؟ اس کے اثرات تو میری ساری تخلیقات میں ہوں گے۔

سوال: اردو ماہیا کے حوالے سے آپ اب سند کا مقام رکھتے ہیں' اردو ماہیے کی بعض خصوصیات بتائیں گے؟

جواب: اردو ماہیے کی بنیادی خصوصیات تو وہی ہیں جو پنجابی ماہیے کی ہیں تاہم جب کوئی تجربہ وسعت اختیار کرتا ہے تو اس میں بہت سا ''کچھ اور'' بھی آجاتا ہے۔ایک اہم ترین خصوصیت ماہیے کی یہ ہے کہ یہ تخلیق کار کو خلا سے اتار کر زمین پر لاتا ہے۔ماہیے میں زندگی اور دھرتی سے گہری وابستگی ہے۔پھر اس میں ژولیدہ ابہام گوئی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔یوں مجھے لگتا ہے کہ اپنی ان دو خصوصیات کے باعث ماہیا' اردو میں ایسے وقت میں مقبول ہوا جب جدید شاعری کے نام پر انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لایعنیت سے جوڑ لیا تھا۔ادب دھرتی سے کٹ کر خلا میں معلق سا ہوگیا تھا۔ایسے حالات میں ماہیے نے نہ صرف اپنی دھرتی کی اہمیت کا احساس دلایا ہے بلکہ بامعنی تخلیق کے لئے لفظ و معنی کے ہم رشتہ ہونے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔سو ماہیے کی یہ ایسی خصوصیات ہیں جن سے ماہیے کی اپنی پہچان تو ہے' سو

ہے۔۔۔خود ماہیے کے ذریعے سے انتہا پسند جدیدیت کو بھی اعتدال کی راہ دکھائی گئی ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک ماہیے کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اگر دس سال پہلے کی صورتحال سامنے رکھوں اور پھر آج ماہیے کی مقبولیت دیکھوں تو ماہیے کا مستقبل بے حد درخشاں دکھائی دیتا ہے۔تاہم اس کا درست فیصلہ بہرحال آنے والا وقت کرے گا۔اس وقت تین سو کے لگ بھگ ماہیا نگار ہیں اور اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔پاکستان' یورپ اور انڈیا سے مجموعی طور پر بیس سے زائد ماہیے کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔علمی لحاظ سے بحث مباحثہ کی صورتحال اہلِ ادب کے سامنے ہے۔

سوال: دیارِ مغرب میں شعر و ادب کی صورتحال کیسی ہے؟

جواب: ادب کی دو لائنیں ہمارے پورے ادبی منظر میں موجود ہیں۔ایک تخلیقی اور اکیڈمک لائن اور دوسری شوبز نس کی لائن۔مغربی ممالک کے بیشتر شعراء ادب کی شوبز لائن سے تعلق رکھتے ہیں۔مشاعرہ بازی' کتابوں کی رونمائیاں اور ریڈیو ٹی وی کے پروگرام اسی لائن کی چیزیں ہیں۔ویسے کبھی کبھار اس لائن میں کوئی اچھی چیز بھی آجاتی ہے۔دوسری اکیڈمک اور تخلیقی لائن ہے۔اس میں ہمارے ہاں بہت کم لوگ ہیں۔ڈاکٹر گیان چند جین' ڈاکٹر ستیہ پال آنند' شان الحق حقی' ساقی فاروقی' ہرچرن چاولہ' جیسے لوگ اس زمرہ میں آتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کا بنیادی مسئلہ ادب نہیں بلکہ وطن کی اداسی ہے۔سو اسی یادِ وطن میں لکھ لکھا (''لکھ'' کم اور ''لکھا'' زیادہ) لیتے ہیں۔اور خود ہی اپنے اعزاز میں تقریبات کرا کے خوش ہو لیتے ہیں۔یہاں مشاعروں میں ایک تہائی سے زیادہ شعراء دھڑلے سے بے وزن کلام سناتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔اسی سے ادب کی صورتحال کا اندازہ کرلیں۔بعض شعراء اور شاعرات بے وزن شاعری کے مجموعے بھی چھپوا لیتے ہیں اور بعد میں انہیں چھُپاتے پھرتے ہیں۔ویسے وہ گروہ ان سب سے بازی لے گیا ہے جو ایک مصرعہ لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن نقد ادائیگی کے نتیجہ میں اپنے نام سے پورا شعری مجموعہ چھپوا لیتا ہے اور اسی پیسے کے بَل پر بھرپور تقریبات کا اہتمام بھی کرلیتا ہے۔مالی رشوت کے ساتھ بعض شاعرات کے معاملہ میں جمالی رشوت کے چرچے بھی سننے میں آرہے ہیں۔

سوال: دیارِ مغرب میں اردو صحافت کا کیا حال ہے؟

جواب: امریکہ سے ایک اچھا ادبی رسالہ ''آواز'' نکلتا ہے۔انگلینڈ سے ''سفیرِ اردو'' اور ''صدا'' نکلتے ہیں۔ڈنمارک سے سماجی اور ادبی رسالہ ''شاہین'' نکلتا رہا ہے۔بیچ میں بند ہوگیا تھا اب پھر اس کا اجرا ہو رہا ہے۔ڈیلی جنگ لندن اور ویکلی راوی بریڈفورڈ کے ادبی صفحات چھپتے ہیں۔جرمنی سے اردو دنیا جاری ہوا ہے۔ارشاد ہاشمی اور جاوید خان اسے مسلسل ماہنامہ کے طور پر نکال رہے ہیں۔غالباً یہ پہلا ادبی خبرنامہ ہے جس

نے پوری اردو دنیا میں تحرک پیدا کیا ہے۔ میں نے بھی جرمنی سے ''جدید ادب'' شروع کیا ہے۔ یہ تو ان رسائل اور اخبارات کا ذکر ہے جو میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے علاوہ بھی بعض رسائل ہوں جو میرے علم میں نہ ہوں یا مجھے اس وقت یاد نہ آرہے ہوں۔

سوال: آپ زندگی کا مقصد کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: میں ابھی تک زندگی کے بھید کو ہی نہیں سمجھ پایا' اس کے مقصد کو کیسے سمجھ پاؤں!

سوال: مذہب کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟

جواب: میرے نزدیک مذہب کے دو رُخ ہیں۔ ایک عقائد اور فروعات سے متعلق اور دوسرا بندے اور خدا کے تعلق سے متعلق۔ پہلا رُخ تو ایسا ہے کہ یہ ہر انسان کے اپنے ذہن اور سوچ کی حد تک ہوتا ہے۔ یار لوگ اسی بات پر لڑنے مرنے پر تُل گئے کہ حضرت آدم کی ناف تھی یا نہیں تھی؟ اور کوا حلال ہے یا حرام؟ سو فروعات والے رُخ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ البتہ بندے اور خدا کے تعلق کے حوالے سے میرا خیال ہے کہ ہر بندے کی خدا سے تعلق کی اپنی ہی نوعیت ہوتی ہے۔ وہ ہر کسی پر اس کی توفیق اور طلب کے مطابق ظاہر یا منکشف ہوتا ہے۔ اسے آپ مذہب کا روحانی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ مجھے اس پہلو سے گہری دلچسپی ہے۔ اسی لئے تصوف سے میری رغبت مزید بڑھ گئی ہے۔ میں رُوح کی بالیدگی اور ترفع کے لئے روحانیت کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہوں۔

سوال: شعر و ادب کے حوالے سے آپ کا آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟

جواب: ابھی تک جتنا کام ہوا ہے' خدا کے فضل اور اسی کی دی ہوئی توفیق سے ہوا ہے اور آئندہ بھی جو ہوگا اسی کی دی ہوئی توفیق سے اور اسی کے فضل و کرم سے ہوگا۔ مجھ گنہگار پر اس کے بڑے ہی فضل اور کرم ہیں۔ میں تو بس شکر گزاری کی تھوڑی سی کوشش کر لیتا ہوں اور وہ مجھے سرشار کر دیتا ہے۔

سوال: اپنا کوئی تازہ کلام تھوڑا سا سنائیے گا؟

جواب: ایک تازہ ماہیا ہے:

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی

اور تازہ غزلوں کے چند شعر ہیں:

ایک خوشخط سے شخص نے حیدرؔ
ہم کو بھی خوش خیال کر ڈالا

آسیب بنے بیٹھے تھے مدت سے جو دل میں
خود اس نے نکالے وہی ڈر' اور مکمل
ہو جائے نہ مغرور کہیں اور وہ حیدرؔ
اب اس سے کرو صرفِ نظر' اور مکمل

درختوں پر پرندے لوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے
اندھیرا اس قدر گہرا گیا ہے دل کے اندر
کوئی سورج اُبھر جانا ضروری ہو گیا ہے

حیدر قریشی کا شعری سفر ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ انہیں میں نے بیس سوالات پر مشتمل سوالنامہ بھیجا تھا جس کا جواب انہوں نے تفصیل سے دیا۔ ان کی تحریر میں مطالعہ اور فکر کی عمیق گہرائی ملتی ہے۔ آپ ان کے نظریات، ان کی سوچ اور ان کے مطمع نظر سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی کہی ہوئی باتوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ یقیناً ان کے جوابات فکر کی نئی راہیں کھولتے ہیں اور مزید دعوت فکر دیتے ہیں۔------------------------------ **سلطانہ مہر**

(بحوالہ تذکرہ ''سخنور'' حصہ دوئم۔ مرتب کردہ سلطانہ مہر
ناشر: مہر بک فاؤنڈیشن۔ لاس اینجلس۔ امریکہ)

حیدرقریشی سے ایک مکالمہ

محمد وسیم انجم (راولپنڈی)

حیدرقریشی کی پہلودار شخصیت میں شاعراور نثر نگار مختلف جہتوں میں نمایاں ہیں۔ یہ اردوادب کی بیشتر اصناف میں بھر پور حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا دائرہ 25 برسوں پر محیط ہے۔ جو خانپور کے جیٹھہ بھٹہ بازار میں ایک فرشی نشت اورہفت روزہ "مدینہ "بہاولپور میں صحافتی وادبی ڈائری سے شروع ہوتا ہے۔ پھر شاعری اور نثر میں بھر پور تخلیقی و تحقیقی کاوشیں رونما ہوئیں۔جن کی بدولت ایک تخلیق کار جلوہ افروز ہیں۔

☆ حیدرقریشی صاحب !سب سے پہلے ہمیں اپنے خاندان کے پس منظر سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بتایئے کہ آپ سے قبل ایسی صلاحیتوں کی مالک کوئی شخصیت ادب کے آسمان پر اس طرح جگمگائی جس حیثیت سے آپ آسمان ادب کے افق پر روشن ستارہ ہیں۔اور کیا نسل نو میں بھی ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں؟

حیدر قریشی: میرے والد صاحب کی کپڑے کی دوکان تھی۔ ہمارا خاندان متوسط طبقے کا خوشحال گھرانہ تھا۔ لیکن جب اباجی کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو نہ صرف اباجی کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلرنگ شاپ تک آ گئے بلکہ ہم لوگ بے حد تکلیف دہ غربت کی زد میں آ گئے۔ میرے خاندان میں صرف میری امی جی کو ادب کے مطالعہ کا شوق تھا۔ ایک زمانے میں انہوں نے پنجابی میں ایک وعائیہ نظم بھی کہی تھی۔ ہاں میرے میرے سب سے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے۔اور میں بچپن میں انہیں حیرت اور خوشی سے دیکھا کرتا تھا۔ کہ میرے ایک ماموں شاعر بھی ہیں۔ باقاعدہ طور پر میں ہی ادبی دنیا میں آیا ہوں۔نسل نو میں ابھی تک کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جس سے امیدیں وابستہ کی جاسکیں۔اپنی چھوٹی بیٹی سے مجھے کچھ توقع تھی۔لیکن ابھی تک کوئی بہتر اور یقینی صورت نظر نہیں آ رہی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میرے دونوں چھوٹے بچے ٹیپو اور مانو عام طور پر میری نئی تحریریں

میرے پاس آ کر مجھ سے سنتے ہیں۔اور پھر انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ جرمنی میں شاید یہ بھی غنیمت ہے۔

☆ شاعر اور ادیب بیک وقت خاندان کا رکن، معاشرے کا فرد اور معاشی عمل کا پرزہ ہوتا ہے۔ان سب سے آپ کس حد تک انصاف کر پاتے ہیں؟

حیدر قریشی: اپنے والدین کی میں نے بساط کے مطابق خدمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ بیوی بچوں کے ساتھ میرا رشتہ محبت اور دوستی کا ہے۔ پاکستان میں تو میں اپنے بیوی بچوں کو کچھ نہیں دے پایا تھا۔لیکن انہوں نے ہر دکھ میں ساتھ نبھایا۔ میرے پاکستانی معاشرے نے معاشی تنگدستی کے باعث مجھے خودکشی کے مقام تک لا کھڑا کیا تھا۔اس گناہ سے بچ گیا ہوں تو سراسر خدا کا فضل اور احسان ہے۔ پاکستان میں تھا تو اپنے معاشرے اور معاشی نظام سے دکھی تھا۔لیکن اب جرمنی میں آ گیا ہوں تو وہی معاشرہ شدت سے یاد آتا ہے۔اور اداس کرتا ہے۔ میں نے ساری زندگی محنت مزدوری کر کے گزاردی ہے۔ایک محنت کش،مزدور اپنے معاشرے اور معاشی نظام سے جتنا انصاف کرسکتا ہے اتنا تو میں نے کیا ہی ہے۔

☆ آپ کی تصانیف "عمر گریزاں" اور "میری محبتیں" میں تاریخ ولادت متنازعہ تھی۔جس کی وضاحت دوماہی "گلبن" احمد آباد بھارت کے ماہیا نمبر میں کردی گئی۔اس کے پس منظر میں علامہ اقبال کی متنازعہ فیہ تاریخ ولادت تو نہیں جو ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے؟

حیدر قریشی: ہوسکتا ہے غیر ارادی طور پر یہی وجہ رہی ہو۔لیکن بھائی! کہاں علامہ اقبال اور کہاں میں ایک معمولی سا ادیب۔

☆ آپ نے محمد امین زبیری کی کتاب ''خدوخال اقبال'' پر تبصرہ تحریر کیا تھا۔ جو مجلّہ'' اوراق'' کے اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء شمارہ میں شائع ہوا۔اس کے بعد آپ نے اقبالیات پر کچھ تحریر نہیں کیا۔البتہ آپ کی شاعری میں فکر اقبال کے ساتھ ساتھ غالب اور ڈاکٹر وزیر آغا کے اثرات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔آپ کونسی شخصیت سے زیادہ متاثر ہیں۔اور کیوں؟

حیدر قریشی: "خدوخال اقبال" پر میرا جو تبصرہ چھپا تھا اس کے پس منظر میں میرا اُس وقت کا فکری منظر نامہ موجود تھا۔اس کے بعد علامہ پر کچھ نہیں لکھا تو اس لئے کہ ان پر نیا لکھنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔آپ نے اب میری شاعری پر غالب اور وزیر آغا کے ساتھ اقبال کے اثرات کی بات کی ہے تو مجھے حیرت ہوئی۔۔۔۔اب میں نے غور کیا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اقبال تو لاشعوری طور پر میرے اندر گھسے ہوئے ہیں۔

☆ اردو ماہیا میں آپ نے بھر پور تخلیقی وتنقیدی کام کیا ہے۔اس تحریک کو آگے بڑھانے میں آپ کی کاوشوں کا

اعتراف ضروری ہے۔جس کے مطابق ماہیے کی ہیئت اور وزن کا معاملہ تو تقریباً طے پا گیا ہے۔لیکن اس کے مزاج کے متعلق پیش رفت کی مزید ضرورت ہے۔اہل قلم کے تنقیدی مضامین اور موجودہ ادبی حالات کے تناظر میں مختلف آراء کے ساتھ ماہیے کے مستقبل کا تعین کریں۔

حیدر قریشی :اردو ماہیے کو میری وجہ سے فائدہ بھی ہوا ہے اور نقصان بھی پہنچا ہے۔فائدہ تو یہی کہ ماہیا ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔نقصان یہ ہوا کہ مجھ سے کسی کو کوئی ناراضگی تھی،کوئی برہمی تھی تو اس کا بدلہ لینے کے لئے ماہیے کو زد پر رکھ لیا گیا۔حاسدین اور علمی سطح پر بے بس ہو جانے والوں نے بھی ادبی فضا کو گرد آلود کرنے کی کوشش کی۔یوں میری ہی وجہ سے ماہیے کو نقصان پہنچا ہے۔تاہم اب امین خیال، ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، احمد حسین مجاہد، گوہر شیخ پوری، شارق جمال، اسلم حنیف، رؤف خیر، اختر رضا کیکوٹی اور عارف فرہاد اور آپ جیسے نوجوانوں کے آگے آنے سے اردو ماہیے کی تنقیدی فضا بہتر ہو رہی ہے۔مزید بھی کئی اہم ادیب اس طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔مزاج کا معاملہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ طے ہوتا جائے گا۔

☆ اردو ماہیے کے حوالے سے بعض معترضین نے آپ پر الزامات بھی عائد کئے ہیں جو ادب سے زیادہ مذہب پر مبنی ہیں۔آپ اپنی صفائی میں کچھ بیان کرنا پسند فرمائیں گے۔

حیدر قریشی: آپ خود بتائیے ماہیے کی علمی بحث میں کسی بھی مذہب یا مسلک کے تنازعہ کو کھڑا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔مذہب ہر انسان اور خدا کا براہ راست معاملہ ہے۔ہر شخص اپنے عقیدے اور اعمال کے مطابق اگلے جہان میں جزا اور سزا پائے گا۔میں اس وقت اپنے عقیدے کی وضاحت کر کے بہت سے مخالفوں کو شرمندہ کر سکتا ہوں۔لیکن میں کسی مذہبی بلیک میلنگ کا شکار ہو کر کبھی بھی کسی کے دباؤ میں نہیں آؤں گا۔ماہیے کی بحث کو کافروں کی انتشار پیدا کرنے کی سازش کہہ کر ہمارے مخالفین نے حقیقتاً علمی سطح پر اپنی بے بسی اور شکست کا اعتراف کر لیا ہے۔اب ان کے پاس بہتان طرازی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔اسی لئے اختر رضا کیکوٹی نے بر وقت ایسے عناصر کا تعاقب کیا تھا اور احمد حسین مجاہد نے بھی بجا طور پر ان کے بارے میں لکھا تھا"اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس اردو ماہیے کے وزن کے مسئلے پر کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔کیونکہ جب انسان کے پاس دلیل نہ ہو تو وہ دشنام طرازی پر اتر آتا ہے"۔

☆ ادب میں تنقید ایک مستقل موضوع ہے۔اس کی اہمیت کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے ہوئے ،نقاد کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے عصر حاضر میں اچھے ناقدین کا ذکر کریں۔

حیدر قریشی:تنقید تخلیقی ادب پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔اور تخلیقی ادب سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ہمارے

ہاں بے شک تنقیدی فیصلوں میں بعض گھپلے بھی ہوئے ہیں۔لیکن عمومی طور پر اردو تنقید ٹھیک ہی جا رہی ہے۔بہت سے نقاد اپنی بعض ترجیحات کے باوجود مجموعی طور پر اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔عصر حاضر کے نقادوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی، جیلانی کامران، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، دیویندر اسر، ڈاکٹر انور سدید، سلیم احمد، شمیم احمد، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی سے لیکر ناصر عباس نیّر تک متعدد اہم نقاد ہیں، جو کسی نہ کسی زاویے سے خاص اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔

☆ آپ کی شاعری کو 25 سال مکمل ہو چکے ہیں اور پچیس سالہ شاعری پر کلیات بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔شاعری کے اس دور کو آپ کتنے حصوں میں منقسم کریں گے۔اور اس دوران اپنے نشیب و فراز پر روشنی ڈالئے۔

حیدر قریشی:میں نے اپنے اندر کے نقاد کی مدد سے اپنی شاعری کو چار ادوار میں بانٹ کر دیکھا ہے۔اور اس کا ذکر اپنی کتاب "غزلیں، نظمیں، ماہیے" میں کیا ہے۔

ا۔روایتی غزل کا دور۔۲۔انتہا پسند جدیدیت کے زیر اثر غزل کہنے کا دور۔
۳۔انتہا پسند جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا دور۔۴۔اور سابقہ تینوں ادوار کے مثبت اثرات سے مل کر بنا دور جہاں تک نشیب و فراز پر روشنی ڈالنے کا تعلق ہے تو یہ کام تو قاری اور ناقد کو کرنا ہے۔

☆ آپ نے آزاد نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔آپ کے نزدیک آزاد نظم اور نثری نظم کے مستقبل میں کیا امکانات ہیں؟ ان کی زندگی کا انحصار کن وجوہات پر ہے؟ ان دونوں کے فرق اور باہمی تعلق پر کچھ بتلائیے۔

حیدر قریشی :آزاد نظم شاعری ہے۔لیکن نثری نظم شاعری نہیں ہے۔اس میں شعری مواد تو ہوتا ہے۔لیکن شاعری نہیں بن پاتا۔ایک خوبصورت عمارت کو اگر نظم مان لیں تو اس عمارت میں استعمال ہونے والے سارے میٹریل کا ڈھیر نثری نظم ہے۔جب تک یہ میٹریل فن تعمیر میں صرف ہو کر اپنے وجود کا اظہار نہیں کرے گا۔تب تک صرف شعری مواد رہے گا۔شاعری نہیں بن پائے گا۔مغرب میں بے جا آزادی کے معاشرتی رجحان نے نثری نظم جیسی اصناف کو ادب کی سطح پر قبول کیا ہے۔لیکن ہم مغرب کی اندھی تقلید تو نہیں کر سکتے۔ایک حد تک ہی ان کے فیوض سے استفادہ کر سکتے ہیں۔مغرب میں شادی کے بغیر بچہ پیدا کر لینا عیب نہیں ہے۔لیکن ہمارا معاشرہ اس "خوبی" کو قبول نہیں کر سکتا۔

☆ برصغیر پاک و ہند میں کسی صنف سخن کو زیادہ پذیرائی حاصل ہے؟

حیدر قریشی:تمام تر مخالفتوں کے باوجود اردو غزل آج بھی برصغیر کی سب سے طاقتور صنف ہے۔غزل کی تحقیر کرنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اچھی غزل کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

☆ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی آپ نے اچھا خاصا کام کیا ہے۔آپ کے افسانوں اور انشائیوں کو پڑھنے کے بعد متعدد شخصیات میں ڈاکٹر وزیر آغا، انتظار حسین اور بالخصوص سعادت حسین منٹو، مشتاق قمر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔آپ کن شخصیات سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟

حیدر قریشی: میری انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بہت بڑا حصہ ہے۔باقی انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر، انور سدید، مشتاق قمر اور اکبر حمیدی مجھے اچھے لگتے ہیں۔شاید ان کے اثرات بھی میرے انشائیوں میں ملتے ہوں۔افسانہ نگاری میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو کو اردو افسانے کے بھی اور اپنے بھی پیش رووں میں شمار کرتا ہوں۔جدید افسانہ نگاروں میں مجھے جوگندر پال اور رشید امجد نے متاثر کیا ہے احمد جاوید کے اثرات بھی مجھے کہیں کہیں محسوس ہوتے ہیں۔

☆ جب آپ نے پروفیسر مشتاق قمر کی رحلت پر حاضری کا بتلایا تو مجھے آپ کی تصویر کا عکس ماضی کے دھندلکوں میں لے گیا۔اور میں نے پالیا کہ آپ ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر اور رشید نثار کی ہمراہی میں شامل تھے۔پروفیسر مشتاق قمر کی نگارشات بھی آپ نے پڑھی ہوں گی ان کے فن اور شخصیت پر اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے مفصل بات کیجیے۔

حیدر قریشی: میں مشتاق قمر کے انشائیوں اور افسانوں کا باقاعدہ قاری رہا ہوں۔اور انہیں دونوں حیثیتوں میں پسند کرتا رہا ہوں۔افسوس ان کی بے وقت موت نے اردو ادب کو ایک اچھے انشائیہ نگار اور اچھے افسانہ نگار سے محروم کر دیا۔افسوس ذاتی طور پر ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔میں ان کی وفات پر تعزیت کے لیے حاضر ہوا تھا۔

☆ ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق پیاری ہوتی ہے۔اور بے حد اچھی لگتی ہے۔آپ کی تخلیقات اردو ادب میں احسن اضافے ہیں۔بعض تصانیف نے تہلکہ بھی مچایا ہوگا۔آپ کس تصنیف سے زیادہ مطمئن ہیں۔اور اس کی کیا وجوہات ہیں؟

حیدر قریشی: شاعری میری پہلی محبت ہے۔لیکن میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کونسی صنف یا تصنیف زیادہ اچھی لگی۔میرے لئے تو میری ہر تخلیق اور ہر تصنیف اپنی اپنی جگہ اہم ہے۔تاہم مطمئن ہو جانے والی بات کہیں بھی نہیں ہے۔ہر تخلیق کے بعد ذہنی اور روحانی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔لیکن خوب سے خوب تر کی جستجو تو ہمیشہ رہے گی۔

☆ عصر حاضر میں متعدد چھوٹے بڑے رسائل اور گروپس معرض وجود میں آچکے ہیں۔جن سے ادب میں مقابلے کا رجحان پایا جاتا ہے۔لیکن بعضے بلاوجہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف رہتے ہیں۔اور ان کی تنقید

برائے تنقید ہی ہوتی ہے۔اردو ادب کی تحریکوں کے تناظر میں رسائل اور ناقدین کے ماضی اور حال کے حوالے سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: ادب میں مقابلے کا رجحان بری چیز نہیں ہے۔لیکن یہ مقابلہ علمی اور تخلیقی سطح پر ہونا چاہیے تھا۔افسوس ہے کہ وطن عزیز کی کرپٹ سیاست نے ادبی سیاست کو بھی کرپٹ کر دیا ہے۔مخالفت میں ذاتیات کی سطح پر آنے کے بعد غنڈہ گردی کے مظاہرے بھی ہونے لگے ہیں۔میں ابھی تک ادبی رسائل کی اہمیت کا معترف تھا اور اخبار کے ادبی صفحہ کو غیر ادبی چیز سمجھتا تھا لیکن اب بعض ادبی رسائل نے اپنے کردار سے، اپنے طرز عمل سے ایسے غیر ادبی رویوں کو فروغ دیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اچھے اخبارات کے ادبی صفحے زیادہ پُر وقار اور معیاری لگنے لگے ہیں۔اس کے باوجود بیشتر ادبی رسائل اپنا ادبی فریضہ احسن طور پر ادا کر رہے ہیں۔اور انہیں کے دم قدم سے ادبی رسائل کا وقار بنا ہوا ہے۔

☆ پاکستانی ادب کے حوالے سے ہمیں دوسرے ممالک کے ساتھ ادبی روابط کیسے رکھنے چاہیں۔ان میں ہندوستان اور جرمنی وغیرہم کے حوالے سے بات کیجیے۔

حیدر قریشی: جب ہم پاکستانی ادب کی بات کریں گے تو اس میں ساری علاقائی زبانوں کا ادب بھی آ جائے گا۔اور گفتگو کا دائرہ بہت زیادہ پھیل جائے گا۔اردو میں پاکستانیت کی بات کریں تو پاکستانیوں کا تخلیق کردہ سارا ادب ہی پاکستانی ہے۔ایک سطح پر یہ اپنی دھرتی کے دائرے کے اندر ہے۔دوسری سطح پر برصغیر کے دائرے تک پھیلتا ہے۔اور تیسری سطح پر عالمی دائرے تک جاتا ہے۔اور ہر دائرے کی اپنی ایک اہمیت ہے۔انڈیا کے اردو ادب کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس سے لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے۔مغربی ملکوں سے رابطے کی ایک صورت ترجمہ ہے۔اس میدان میں تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے۔ڈاکٹر کرسٹینا نے اردو ادیبوں کی تخلیقات کا انتخاب کر کے اس کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا تھا۔لیکن ان کے ایک انٹرویو کے مطابق اس کتاب کا انہیں جرمن قارئین کی طرف سے کوئی ریسپانس نہیں ملا۔سو ترجمے کا بیشتر کام بھی صرف اپنے آپ کو خوش کرنے والا ہے۔ایسی صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے ادب کو اپنی جڑوں سے منقطع نہ ہونے دیں۔ہمیں بین الاقوامیت ملے نہ ملے، اپنا آپ تو مل جائے گا۔

☆ تحقیقی میدان میں ہندوستان ہم سے آگے ہے۔اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔

حیدر قریشی: تحقیقی میدان میں پاکستان میں بھی معیاری کام ہوا ہے۔تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندوستان اس میدان میں ہم سے آگے ہے۔

☆ شعراء وادباء کے مسائل پر بات کرنا پسند فرمائیں گے۔ کیونکہ ہمارے ہاں ان کے چلے جانے کے بعد بڑے بڑے کالم لکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے تعزیتی ریفرنس منعقد ہوتے ہیں لیکن اکثر کی زندگی کسمپرسی میں ہی بسر ہوتی ہے۔

حیدر قریشی: شاعروں اور ادیبوں کا ذریعۂ آمدنی ادب نہیں ہے۔ جسے ہم اعلیٰ معیار کا ادب کہتے ہیں اس کا تو دنیا بھر میں وہی حال ہے جو پاکستان میں ہے۔ ہماری زندگیاں اگر کسمپرسی میں بسر ہوتی ہیں تو اس کی وجہ ہمارے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ہے۔ صرف ادیب ہی نہیں لاکھوں دوسرے عوام بھی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کم از کم ادیبوں کی سطح پر ہمارا فرض بنتا ہے کہ حکومت سے اہم اقدامات کرائے جائیں۔ لیکن یہ اقدامات امداد دلانے والے نہیں بلکہ مناسب روزگار دلانے والے ہونے چاہیں۔

☆ آپ ادبی اور معاشی لحاظ سے جو کچھ کر رہے ہیں کیا اس سے مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: ادبی لحاظ سے جرمنی میں بیٹھ کر مجھے جتنا کام کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ اس پر میں اپنے خدا کا بے حد شکر گزار ہوں۔ معاشی لحاظ سے صورت حال یہ ہے کہ میری ملازمت سے مجھے جو تنخواہ ملتی ہے اس سے ہمارے گھر کا کرایہ بھی ادا نہیں ہوتا لیکن یہاں کے فلاحی قوانین کے مطابق میرے خاندان کی کم از کم ضروریات کی بقایا رقم حکومت خود ادا کرتی ہے۔ سو یہ میرے لئے اطمینان بخش نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یا تو جلد ہی سارے بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ پھر میری تنخواہ ہم میاں بیوی کے لیے مناسب رہے گی۔ یا پھر مجھے کوئی اور بہتر ملازمت مل جائے جس سے میں اپنے خاندان کی کفالت خود کر سکوں۔

☆ حیدر قریشی صاحب! آخری سوال کی جسارت کر رہا ہوں۔ آپ اپنے معترفین و معترفیسن کے لیے پیغام دینا پسند فرمائیں گے؟

حیدر قریشی: میرے معترفین؟۔۔۔۔ بھائی! آپ جیسے چند دوست ہیں جن کی محبت مجھے حوصلہ دیئے رکھتی ہے۔ پیغام تو ان کے لیے کوئی نہیں ہے بس یہ دعا ہے کہ خدا ان ساری محبتوں کو قائم رکھے۔ جہاں تک معترضین کا تعلق ہے ان کی چند قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ احباب جو ادبی اختلاف رکھتے ہیں اور مہذب ادبی زبان میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں میں معترض ہونے کے باوجود محبت کرنے والے دوستوں میں ہی شمار کروں گا۔ کیونکہ یہ اختلاف کرتے ہیں تو میرے اختلاف کو برداشت کرنے کا ظرف بھی رکھتے ہیں۔

۲۔ وہ احباب جو خود تو اختلاف کرتے ہیں لیکن جب انہیں علمی طور پر جواب دیا جاتا ہے تو کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے کی

بجائے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پھر خود پس پردہ رہ کر دوسرے لوگوں سے ذاتی حملے کراتے ہیں۔

۳۔ وہ احباب جو کسی ذاتی رنجش کے باعث مجھ سے خفا ہوتے ہیں اور پھر اسے ادبی مسئلہ بنانے لگ جاتے ہیں۔

ان دونوں طرح کے دوستوں کے ساتھ میں نے بھی ایک حد تک لڑائی لڑی ہے میری تہذیب مجھے ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتی۔ اس لیے میں ایسے دوستوں کا غیر علمی اور ذاتی لڑائی کے مقابلے میں زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکا۔ تاہم ان سب نے میرے ساتھ جو کچھ کیا میں اس پر بھی شرمندہ ہوں اور میں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر بھی شرمندہ ہوں۔ میری دعا ہے کہ ہمارے ادیب ادبی مسائل پر شخصیات کو نشانہ بنانے کی بجائے مسائل پر علمی سطح پر بات کرنے کے قابل ہو جائیں۔

۴۔ چوتھی قسم ان احباب کی ہے جو دوسروں کی کارکردگی دیکھ کر حسد کرتے ہیں۔ میرے معترضین کی ایک بڑی تعداد ایسے حاسدین پر مشتمل ہے ان کے لیے میں اس قرآنی دعا کا ورد کرتا رہتا ہوں۔ **و من شر حاسد اً اذا حسد**

☆ حیدر قریشی صاحب! آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میرے متعدد سوالات پر سیر حاصل گفتگو فرمائی جس سے آپ کے فکری و فنی گوشے منور ہوئے اور یقیناً ناقدین کی تشفی بھی ہوئی ہوگی۔

حیدر قریشی: محمد وسیم انجم بھائی! یہ صرف آپ کی محبت ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

(بشکریہ کتاب " حیدر قریشی فکرو فن"از: محمد وسیم انجم انجم پبلشرز۔ کمال آباد نمبر۳۔ راولپنڈی ۔مطبوعہ اگست ۱۹۹۹ء)

حیدر قریشی۔۔۔۔۔۔۔ آج خط ملا۔ سکھر گیا تھا۔ ایک بابا کو سلام کرنے۔ جاتے اور آتے خان پور کے سٹیشن پر تجھے پاس بٹھائے رکھا۔ بہت کچھ کہا سنا۔ اب جو کہتے ہو تو کہانی بھیج دیتا ہوں لیکن پسندیدہ نہیں اس کے علاوہ دوسری موجود نہیں، مجبوری وہ چھپی ہوئی پسندیدہ ہے۔ 'سندرتا کا راکشش' چلو ایک دال، ایک چاول، کھچڑی کوئی بُری چیز نہیں۔ جب بھی میں نے تم سے ضد کی، میں ہارا تم جیتے۔ اللہ کسی شریف آدمی کا پالا وکیل سے نہ ڈالے چاہے وہ داڑھی والا ہی کیوں نہ ہو۔ یارانِ وطن بھجوا رہے ہیں۔ ملتا ہے یا نہیں؟.......... **مفتی**

(بحوالہ ممتاز مفتی بنام حیدر قریشی خط مطبوعہ ''جدید ادب'' خانپور شمارہ: ستمبر ۱۹۸۱ء)

چند لمحے حیدر قریشی کی غزلوں کے ساتھ

کالی داس گپتا رضا (ممبئی)

ابھی حال ہی میں (مارچ 1999) شولا پور مہاراشٹر کے اردو میلے کی افتتاحی تقریر میں میں نے کہا تھا کہ اب ہندوستان میں اردو زبان کی ٹکسال، دہلی یا لکھنؤ نہیں بلکہ ممبئی ہے۔ یہ اس لیے کہا تھا کہ اس وقت اردو کے چوٹی کے ادیبوں کی ایک کھیپ اور دنیا کا عظیم ترین غالب کلکشن اس شہر میں موجود ہیں؛ اور یہاں متعدد ادیب اور ادارے سرگرم عمل ہیں۔ دیوان غالب کامل نسخۂ گپتا رضا اور ماہنامہ شاعر کا جدید اقبال نمبر یہیں مرتب اور شائع ہوئے، اسی طرح پاکستان بھی اب سند کے لیے ہندوستانی مراکز کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہاں بھی کراچی اور لاہور کو مراکز اُردو کی حیثیت حاصل ہے کینیا، مشرقی افریقہ، انگلینڈ، کینڈا، امریکہ، دوبئی، قطر، بحرین سعودی عرب، سویڈن، نا روے وغیر اردو ملکوں میں اب اس زبان کے شاعر اور ادیب جلوہ گر ہیں۔

یہاں روئے سخن ایسے ہی ایک شاعر و ادیب جناب حیدر قریشی کی طرف ہے جو جرمنی میں مقیم ہیں۔ ان کی کتاب ''غزلیں، نظمیں، ماہیے''، میرے پیش نظر ہے۔ اس خوبصورت کتاب کے ناشر جرمنی کی، سرور ادبی اکادمی ہے میرا موضوع ان کی غزل گوئی ہے۔

کتاب ۳۸۴ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں غزلوں کا حصہ وافر ہے۔ یعنی غزلیں ۲۵۳ صفحے پر ختم ہوتی ہیں۔ یہ تمام غزلیں وہ ہیں جو حیدر صاحب نے اپنے چار مجموعہ ہائے کلام سے اخذ کر کے یکجا کر دی ہیں۔ حیدر صاحب کے قول کے مطابق اس کتاب کے چھپنے تک انہوں نے اپنی شاعری کے پچیس سال پورے کر لیے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ پیشہ ور نقاد اس سے بھر پور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں مگر میری دقت یہ ہے کہ میں نقاد نہیں ہوں۔ مجھے شعر گوئی،

تحقیق و تاریخ غالب و غالبیات وغیرہ سے گہری دلچسپی ہے مگر تنقید سے نہیں۔ اس لیے جو کچھ یہاں لکھ رہا ہوں گویا تنقید کی حد تک مجبوراً لکھ رہا ہوں۔

حیدر صاحب کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

یونہی تک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدؔر
بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

اس مقطعے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشعار دیکھئے۔

آج حیدر موڈ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کر لیا

صورت ابو کی اُبھر آئی مرے چہرے میں
دے گئی کیسی خوشی جاتی جوانی اپنی

داؤ پر جو ہمیں لگا بیٹھا
وقت شاید کوئی جواری ہے

چاہے وہ بال بچوں والی ہے
دل کی منطق مگر نرالی ہے
رُوح میری بھی ہے کھرا سونا
تیری دنیا۔۔اگر کٹھالی ہے

بہت بَن ٹھَن کے اب ملنے لگے ہو
تمہیں 'دِکھنا' دکھانا آ گیا ہے

ہونے لگا ہے پیار اسی جلد باز سے

جوتوں سمیت جو مِرے دل میں اُتر گیا

رُوکھے پھیکے پَن کی اب عادت بنانی ہے ہمیں
اتنے میٹھے ہو گئے تھے ہم کہ شوگر ہو گئی

اس بار ہے مہینوال کسی اور نگر کا
سوہنی مگر اس بار بھی گجرات سے آئی

کچھ ایسے ٹوٹ کے ملنا کہ ایک ہو جانا
محبتیں وہ ہماری نرالیاں بھی گئیں
بچی ہوئی تھیں جو دو چار خواہشیں حیدرؔ
لو آج دل سے ہمارے وہ سالیاں بھی گئیں

اگر حیدر صاحب کی شاعری کی یہی الگ راہ ہے تو یہ راہ مستحسن نہیں کہی جا سکتی، لیکن جن غزلوں میں، الگ راہ، نظر آتی ہے وہ اور ہی ہیں اور ان میں وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو تغزل کے ساتھ وابستہ ہیں اور ندرت اس پر مستزاد ہے۔ جیسے،

پھر وقت کے برگد کے تلے گیان کی دھن میں
نکلا ہوا گھر سے کوئی سادھو ہے کہ تُو ہے

اس شعر میں سادھو کا قافیہ خوشبو، آنسو کے ساتھ باندھا گیا ہے جو شعر کے مفہوم کے مجموعی تاثر میں عجیب اضافہ کرتا ہے۔ بعض غزلیں واقعی الگ راہ، کی شاہد ہیں۔ زبان، بیان عمدہ، اور پورا تغزل موجود، شعر پر شعر پڑھتے جایئے اور روح کو بالیدگی بخشتے جایئے۔ چند شعر،

ہمارے ہونٹوں پہ حرفِ وصال باقی ہے
جواب مل چکا پھر بھی سوال باقی ہے
یہ ڈھلتی عمر بھی شعلے مِرے بجھا نہ سکی

لہو میں اپنے ابھی اشتعال باقی ہے

تمہارا حسنِ خداداد تو نہ رہ پایا
مگر فقیر کا حسنِ خیال باقی ہے
کچھ اور بڑھ گیا ہے سلسلہ تذبذب کا
یقین ختم ہوا احتمال باقی ہے

چند شعر ایک اور غزل کے،

چٹان تھا وہ سو اس میں شرر بھی رہتا تھا
شدید ضرب کا مجھ میں ہنر بھی رہتا تھا
اسی کے دَم سے ہمیں اعتبارِ حسن ہوا
دیارِ حسن میں اک معتبر بھی رہتا تھا
یقین تھا کہ محبت کا پاک جذبہ ہے
مگر لہو میں بہت شور و شر بھی رہتا تھا
کشادہ رکھتا تھا بانہیں وہ میرا دریا دل
پر اس کے دل میں کہیں اک بھنور بھی رہتا تھا
کسی کے جسم کا جادو جگا دیا جس نے
ہماری پوروں میں ایسا اثر بھی رہتا تھا

میں نے اس مختصر مضمون میں اشعار کثرت سے دیئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ کتاب دستیاب نہیں اور اگر دستیاب ہو تو ہم کتاب خرید کر پڑھنے کے عادی نہیں، لیکن یہ کتاب ایسی خوبصورت ہے اور اسلوب کلام ایسا ہلکا اور جاذب نظر ہے کہ اسے خرید کے پڑھنے ہی میں ذوق سخن کی سیری ہے۔

حیدر صاحب کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو روایت اور نئے پن کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اس قسم کے اشعار کہنا آسان نہیں، پہلے پہلے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے پھر مشق ہو جانے پر ایسے خوبصورت اشعار لا شعوری طور پر نوک قلم پر جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک غزل، عذاب، ردیف کے ساتھ ہے۔ اس شعر میں مایوسی، محرومی، بدقسمتی کی یادوں کو تلخ بتایا گیا ہے اور عذاب کہا گیا ہے۔ مگر حقیقت میں لفظ عذاب کا استعمال

مٹھاس کا بدل بن گیا ہے۔ سانپ بن کر ڈس گئیں اک دن لکیریں ہاتھ کی

قسمتوں میں رہ گئے اب صرف یادوں کے عذاب

ایک نہایت اچھا شعر پیش نظر ہے۔ اس میں ،تم، سے مراد کچھ بھی ہو مگر اس دو حرفی لفظ نے شعر کو ایسا حسن اور تجسس دیا ہے کہ بار بار لطف اٹھانے کو جی چاہتا ہے۔،

تم تصور بھی نہیں ہو کہ بھلا بھی نہ سکوں

تم عبادت بھی نہیں ہو کہ قضا ہو جاؤ!

بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر زمانے کے چلن سے اور مستقبل سے ناامید نہیں ہے۔

چلو پھر ابلیس کو بلاؤ' اُسے بتاؤ

جو ابنِ آدم پھسل گیا تھا، سنبھل رہا ہے

انسان کو، بلکہ بد دماغوں کے لیے ایک تازیانہ۔

اگر چہ ان کا تعلق ہے عرش سے لیکن

اساس کعبہ و بنیادِ طُور خاک میں ہے

ایک اور خوش آئند مطلع۔

گھنی تاریکیوں میں روشنی کی آس باقی ہے

یہی دولت بہت ہے جو ہمارے پاس باقی ہے

اسی غزل سے ایک چٹ پٹا شعر۔

چلو ہم بے سلیقہ ہیں مگر یہ بھی تو بتلاؤ   سلیقہ عشق کا پھر اور کس کے پاس باقی ہے

ایک دل کو چھو لینے والا شعر۔

گزرتی سرد اور لمبی اندھیری شب کے سینے میں

ابھی کچھ اور شمعوں کا لہو تحلیل ہونا ہے

ضدی، مغرور اور بے حس عالموں فاضلوں پر چوٹ۔

تم اہل علم و فضل ہو لیکن کچھ اس طرح   جیسے کوئی کتاب ہو دیمک لگی ہوئی

شہر بدری کا احساس۔

شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر   جب ترے شہر سے یہ شہر بدر آئے تھے

نقادوں کو نصیحت۔

متن میں آپ کا ہی ذکر چلا آتا ہے   اچھا ہے بچ کے رہیں حاشیہ آرائی سے

بچپن کی معصوم اور خوشگوار یادیں۔

صرف یہ عمر گریزاں ہی نہیں کرتی اداس   میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رلاتا ہے مجھے

اپنی خستہ حالی پر خدا سے در پردہ شکوہ۔

سمندروں کی جگہ دشتِ بے کنار دیا   الٰہی کشتی جاں کو کہاں اتار دیا

ایک بہت آسان مگر گہرا شعر۔

نظروں سے گر گئے ہو   دل سے اٹھا رہا ہوں

نیا اسلوب نئی معنویت۔

ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے   پھر مرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی

ایسے جاندار اشعار کے خالق کو آفرین کہنا ہی پڑتا ہے۔

کہیں کہیں اشعار میں فن شعر کے مروجہ اصولوں کے لحاظ سے جھول بھی ہیں مگر اس کا جواز حیدر صاحب کے کلام میں موجود ہے۔

یہی تذبذب و تشکیک اب سند ٹھہرے   سند سمجھتے تھے جن کو وہ مستند نہ رہے۔

آپ کی کتاب (سلگتے خواب) پر لکھے ہوئے آراء سے مجھے پورے طور پر اتفاق ہے۔ آپ کی شاعری میں تازگی لانے کی سعیٔ جمیل کا پتہ چلتا ہے۔ روایت میں درایت کا رویہ! **مجروح سلطانپوری**

☆☆☆☆

کتاب ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے لئے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کی شاعری مجھے پسند آئی۔ اچھے موڈ میں تھا اس لئے ورق گردانی کرتے وقت کتاب کی ہر غزل اور نظم اچھی لگی۔ **گیان چند جین**

مکاتیب بنام حیدر قریشی

(بحوالہ کتاب ''حیدر قریشی فکر و فن'' مرتب محمد وسیم انجم۔ صفحہ نمبر ۳۶)

حیدرقریشی کے ماہیے اوروزن وارکان

علاّمہ شارق جمال (ناگپور)

حیدرقریشی ایسے ماہیا نگار ہیں جو ماہیے کی صنف کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے لئے برسوں سے کوشاں ہیں۔آپ کی اس کوشش کو دیکھ کرا کثر لوگوں کا یہ گمان تھا کہ حیدرقریشی اردو ماہیے کے خود کو موجد کہلانے کے لئے ماہیے کی ودھا کو آگے بڑھانے کی اردوادب میں ایک تحریک چلا رہے ہیں۔حالانکہ ایسی کوئی بات یا کوئی دعویٰ ان کی جانب سے نہیں۔اس صورتحال سے وہ خود بھی آگاہ ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس کی تردید برابر کئے جارہے ہیں۔ایسی کئی تحریریں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔اب تو ان کتاب''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' بھی شائع ہوچکی ہے۔

حیدرقریشی نے جب اردو کے دوسرے شعراء کو ماہیے کہنے کی ترغیب دی ہے اور آج بھی ترغیب دے رہے ہیں تو خودبھی خوب ماہیے کہے ہیں اور کثرت سے کہے ہیں۔غالباً آپ ۱۹۹۰ء سے ماہیے کہہ رہے ہیں ان کی ماہیے کی ایک کتاب''محبت کے پھول'' بھی شائع ہوچکی ہے۔اور تازہ تصنیف''غزلیں،نظمیں،ماہیے''میں بھی اسی طرح کے اوزان میں ماہیے کہہ کے شامل کئے ہیں۔نذیرفتح پوری کے ماہیے بھی آپ ہی نے مرتب کئے تھے جو''ریگِ رواں'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ماہیے کا یہ مجموعہ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا ہے۔

حیدرقریشی نے کئی اوزان میں ماہیے تو کہے ہیں لیکن کئی انداز سے ماہیے کی تخلیق کی ہے۔بغیرعنوان قائم کئے ہوئے بھی ماہیے کہے ہیں اور عنوان قائم کر کے بھی ماہیا سازی کے عمل کو جاری رکھا ہے۔نیز مکالمے کے انداز میں بھی

ماہیے کی صنف کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔مکالمے کے انداز میں جو ماہیے تخلیق کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ان کے اوزان کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں اوران ماہیوں پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔نوٹ۔۔۔''یہ اردو ماہیے 'پنجابی ماہیے کے اصل وزن کے مطابق ہیں۔ساحرلدھیانوی اور قمرجلال آبادی نے بھی پنجابی ماہیے کے اصل وزن کے مطابق اردو میں ماہیے کہے ہیں۔''۔۔۔۔حیدرقریشی کے ماہیے ملاحظہ فرمائیں:

مرد: کتنے بدنام ہوئے — ارکان: فعلن مفعول فَعَل
پیار میں تیرے ہم — فاع مفاعیلن
پھر بھی بدنام ہوئے — فعلن مفعول فَعَل

عورت: ناکامی سے ڈرتے ہو — ارکان: مفعول مفاعیلن
عشق بھی کرتے ہو — فاع مفاعیلن
بدنامی سے ڈرتے ہو — مفعول مفاعیلن

مرد: اس حال فقیری میں — ارکان: مفعول مفاعیلن
عمریں بیت گئیں — فعلن فاع فَعَل
زلفوں کی اسیری میں — مفعول مفاعیلن

عورت: زلفوں سے رہا ہو جا — ارکان: مفعول مفاعیلن
رب تیری خیر کرے — فاع فعول فَعَل
جا ہم سے جدا ہو جا — مفعول مفاعیلن

مرد: کیا لطف رہائی کا — ارکان: مفعول مفاعیلن
دل جب سہہ نہ سکے — فعلن فاع فَعَل
دکھ تیری جدائی کا — مفعول مفاعیلن

مرد+عورت: ملنا ہو تو ملتے ہیں — ارکان:مفعول مفاعیلن
پھول محبت کے — فاع مفاعیلن
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں — مفعول مفاعیلن

(ماہنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی۔ادب نمبر۔شمارہ اکتوبر۱۹۹۳ء۔صفحہ نمبر۱۰۵)

بغیر عنوان کے حیدر قریشی نے جو ماہیے لکھے ہیں انہیں بھی ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں:

دیوانہ بنا ڈالا — ارکان: مفعول مفاعیلن
دل کو حسینوں نے — فاع مفاعیلن
بت خانہ بنا ڈالا — مفعول مفاعیلن

رہ جاتی ہیں تعبیریں — ارکان:مفعول مفاعیلن
خواب ہیں ہم شاید — فاع مفاعیلن
اور اصل ہیں تصویریں — مفعول مفاعیلن

(''کوہسار جرنل'' مئی ۹۸ء صفحہ نمبر۲۹)

مولا کی عنایت تھی — ارکان: مفعول مفاعیلن
اپنے مقدر میں — فاع مفاعیلن
جرمن کی ولایت تھی — مفعول مفاعیلن

یہ دیس حسینوں کا — ارکان:مفعول مفاعیلن
حال نہیں پوچھو — فاع مفاعیلن
گرمی کے مہینوں کا — مفعول مفاعیلن

ٹھنڈک میں اُبلتے ہیں — ارکان:مفعول مفاعیلن
برف پڑے جتنی — فاع مفاعیلن
جسم اتنے مچلتے ہیں — مفعول مفاعیلن

رنگوں کی ہیں برساتیں — ارکان:مفعول مفاعیلن
ڈھونڈنے نکلو تو — فاع مفاعیلن
ہیں سینکڑوں شالاطیں — مفعول مفاعیلن

(''گلبن'' ماہیا نمبر۱۹۹۸ء صفحہ نمبر۱۳۹)

کچھ اور ماہیے بھی ملاحظہ ہوں جو ان کی ماہیے کی پہلی کتاب ''محبت کے پھول'' میں ہیں۔ماہیے اور ان کے اوزان ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔یہ بھی بغیر عنوان کے ہیں۔

دُھن کتنی ہی پکی ہو — ارکان:مفعول مفاعیلن
پیار نہیں چلتا — فاع مفاعیلن
جب یار ہی شکی ہو — مفعول مفاعیلن

حالات کے دھارے سے — ارکان:مفعول مفاعیلن
آن لگے آخر — فاع مفاعیلن
ہم اپنے کنارے سے — مفعول مفاعیلن

پیپل کی گھنی چھایا — ارکان:مفعول مفاعیلن
گزرے زمانے کا — فاع مفاعیلن
سایا کوئی لہرایا — مفعول مفاعیلن

(''محبت کے پھول'' مطبوعہ۱۹۹۶ء)

انہیں اوزان میں حیدر قریشی کے کچھ اور ماہیے جو ایک عنوان لئے ہوئے ہیں۔انہیں ان کے اوزان کے ساتھ ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں۔عنوان ہے ''عمرِ گریزاں''

خوشیوں کی گھڑی آئی — ارکان:مفعول مفاعیلن
آنکھ کے صحرا میں — فاع مفاعیلن
یادوں کی جھڑی آئی — مفعول مفاعیلن

ماضی کی دشاؤں سے — ارکان:مفعول مفاعیلن
کون بلاتا ہے — فاع مفاعیلن
یادوں کی گپھاؤں سے — مفعول مفاعیلن

''وصال کا موسم'' کے عنوان سے مذکورہ کتاب میں جو ماہیے ہیں'انہیں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

دونوں ابھی بچے تھے — ارکان:مفعول مفاعیلن
رَل مِل کھا بیٹھے — فاع مفاعیلن
امرود جو کچے تھے — مفعول مفاعیلن

دیکھا جو کمادوں کو — ارکان:مفعول مفاعیلن
جان گئی سجنی — فاع مفاعیلن
ساجن کے ارادوں کو — مفعول مفاعیلن

کلیوں کی مہک بھی تھی — ارکان:مفعول مفاعیلن
سانولی لڑکی میں — فاع مفاعیلن
اُپلوں کی مہک بھی تھی — مفعول مفاعیلن

(''محبت کے پھول''۱۹۹۶ء۔)

حیدرقریشی کی تازہ تصنیف ''غزلیں'نظمیں'ماہیے'' (جودراصل ان کے چار شعری مجموعوں کا مجموعہ ہے) سے اِنہیں مندرجہ بالا اوزان کے ماہیے بھی نقل کرر ہا ہوں۔ساتھ ہی ان کے اوزان بھی لکھ رہا ہوں۔

نفرت کے اندھیروں کو — ارکان:مفعول مفاعیلن
توڑ مِرے مالک — فاع مفاعیلن
ظلمات کے گھیروں کو — مفعول مفاعیلن

پھولوں کی ہے نرمی بھی — ارکان:مفعول مفاعیلن
اس کی محبت میں — فاع مفاعیلن

صحراؤں کی گرمی بھی — مفعول مفاعیلن

تب آنکھ برستی ہے — ارکان:مفعول مفاعیلن
دل میں کہیں چھپ کر — فاع مفاعیلن
ماں جب مِری ہنستی ہے — مفعول مفاعیلن

یاد آ ہی گئے آخر — ارکان:مفعول مفاعیلن
کچھ بھی سہی لیکن — فاع مفاعیلن
بھائی ہیں مِرے آخر — مفعول مفاعیلن

(''غزلیں'نظمیں'ماہیے''مطبوعہ۱۹۹۸ء)

ایک سبب کم کر کے (دوسرے مصرع میں) وزن قائم کر کے ماہیے کہنے والی تجویز بہت عام ہو چکی ہے اور اس وزن کو رواج دینے کی سعی میں حیدر قریشی کا نام نمایاں طور پر سرِ فہرست ہے۔ان اوزان کے علاوہ اور بھی اوزان ہیں جن میں حیدر قریشی نے ماہیے کی تخلیق کی ہے۔مثلاً ہمت رائے شرما' قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے فلمی ماہیوں کے وزن پر بھی حیدر قریشی نے ماہیے کہے ہیں جو اک گیت کی صورت میں مترنم آواز میں ایک لَے'اک میٹھی دُھن کے ذریعے سامعین تک پہنچ کر ان کے کانوں میں رَس گھول چکے ہیں۔دونوں طرح کے ماہیے شعراء کے نام اور وزن کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

سہمی ہوئی آہوں نے	مفعول مفاعیلن	رخصت کی گھڑی آئی
سب کچھ کہہ ڈالا	فعلن فعلن فع	دل ماں کا دھڑکا
خاموش نگاہوں نے	مفعول مفاعیلن	آنکھوں میں جھڑی آئی
(ہمت رائے شرما)	--------	(حیدر قریشی)
تم رُوٹھ کے مت جانا	مفعول مفاعیلن	اظہار ضروری ہے
مجھ سے کیا شکوہ	فاع فعلن فع	پیار اگر ہو تو
دیوانہ ہے دیوانہ	مفعول مفاعیلن	اقرار ضروری ہے
(قمر جلال آبادی)	--------	(حیدر قریشی)

سرمست فضائیں ہیں	مفعول مفاعیلن	اقرار کی گھڑیاں ہیں
پیتم پریم بھری	فعلن فاع فَعَل	جگمگ کرتی ہوئی
پھاگن کی ہوائیں ہیں	مفعول مفاعیلن	یہ سہرے کی لڑیاں ہیں
(ہمت رائے شرما)	---------	(حیدر قریشی)
ہم ساتھ نبھائیں گے	مفعول مفاعیلن	جاں وار گئے پیارے
آندھیاں چلتی رہیں	فاع فعول فَعَل	جگ تمہیں جیت گیا
ہم شمع جلائیں گے	مفعول مفاعیلن	ہم ہار گئے پیارے
(قتیل شفائی)	-------	(حیدر قریشی)
فرصت ہو تو آ جانا	مفعول مفاعیلن	سورج ہو کہ خود تُو ہو
اپنے ہی ہاتھوں سے	فاع مفاعیلن	رات کے سینے میں
مِری دنیا مٹا جانا	فعِلن فعِلن فعلن	کوئی تیر ترازو ہو
(قمر جلال آبادی)	--------	(حیدر قریشی)
دل لے کے دغا دیں گے	مفعول مفاعیلن	پرواز پہ پابندی
یار ہیں مطلب کے	فاع مفاعیلن	سارے پرندوں کی
یہ دیں گے تو کیا دیں گے	مفعول مفاعیلن	آواز پہ پابندی
(ساحر لدھیانوی)	--------	(حیدر قریشی)

ان اوزان کے علاوہ ہمت رائے شرما، قمر جلال آبادی، ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی نے اور بھی کئی طرح کے اوزان میں ماہیے کہے ہیں۔ مندرجہ بالا اوزان میں کئی طرح کے ارکان ہیں۔ کئی بحروں کے ارکان و اوزان ہیں۔ ان ارکان سے متعلق لکھنا یہاں مقصود نہیں کہ یہ کن کن بحروں کے ارکان ہیں اور کس طرح کے ارکان ہیں۔ ماہیے کی بحث سے قطع نظر جن اوزان پر اجتماعِ شعراء ہے وہ صرف ایک وزن
مفعول مفاعیلن ------------- فاع مفاعیلن ---------------- مفعول مفاعیلن
ہے اور ماہیے کے تین مصرعوں کے لئے یہی وزن عام ہے اور اسی وزن میں شعرائے اردو کثرت سے ماہیا سازی کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حیدر قریشی کے ماہیے بھی کثیر تعداد میں اسی وزن و ارکان میں ہیں۔ ماہیے کو مختلف اوزان وارکان میں تخلیق کرنے کا سبب ڈاکٹر مناظر عاشق نے یہ بتایا ہے کہ------

''پنجابی شاعری کی ایک خاص، اہم اور مقبول عام صنف ماہیا ہے۔ اسی لئے داخلی نغمگی اور مخصوص وزن نے گائیکی میں اس کی ایک الگ دُھن اور پہچان بنائی ہے۔ پنجابی زبان میں لسانی قواعد وضوابط موجود نہیں ہیں۔ چنانچہ الفاظ کو حسبِ ضرورت کھینچ کر اس زبان میں لمبا بھی کر لیا جاتا ہے اور حروف کو گرا کر مرضی کے مطابق مختصر بھی کیا جاتا ہے۔'' (''رم جھم رم جھم'' صفحہ نمبر ۹)

انہیں باتوں کو اور پنجابی زبان کے ماہیے کی لے اور دُھن کو ذہن میں رکھ کر خود حیدر قریشی نے بھی ماہیے کی تخلیق کے عمل کو مختلف اوزان وارکان میں جاری رکھا ہے۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:

''ماہیے کو عروضی گھیرے میں لینے کی کاوش، عروضی قواعد کو مدِ نظر رکھ کر نہیں بلکہ ماہیے کی لے کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ پھر چاہے بقول گو ہر شیخ پوری مخلوط اوزان بھی اس روانی پر پورے اتریں تو انہیں قبول کر لینا چاہیے۔''
(''اردو ماہیے کی تحریک'' مطبوعہ ماہنامہ ''سخنور'' کراچی شمارہ نومبر ۱۹۹۸ء۔ صفحہ نمبر ۲۰)

بہر حال حیدر قریشی اردو شعر وادب کے مخلص خادم ہیں۔ دوسری اصناف شاعری کے ساتھ ماہیے کی صنف کو بھی آگے بڑھانے، ترقی دینے اور دیگر اصنافِ شاعری سے بہت اونچا اُٹھانے اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے لے جانے کے لئے جو سعی وکوشش کر رہے ہیں، وہ لائقِ تحسین ہے۔

> حیدر صاحب نے نہ صرف ماہیے کی چاشنی کو برقرار رکھا ہے بلکہ ہماری معاشرت جس Transitional دور سے گزر رہی ہے اور ہمارے فطری مناظر میں جو تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں ان کا کسیلا پن بھی اپنے حلق میں محسوس کیا ہے۔۔۔ حیدر قریشی اپنی زمین کے عاشق ہیں مگر کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتے۔ وہ مسلسل کھلی فضاؤں میں پَر پھیلا کر نئے نئے مناظر دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تخیل کی ایک ہی اڑان سے کوسوں دور نکل جاتے ہیں۔ تاسف اور اداسی بھی ہوتی ہے مگر مڑ کر نہیں دیکھتے۔۔۔۔ حیدر قریشی کی کتاب ''محبت کے پھول'' یقیناً اردو ماہیے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سب سے خوبصورت بات یہ ہے حیدر قریشی کا اردو ماہیا Diction کی تبدیلی کے باوجود سراسر پنجابی ماہیا ہے اور یہ ان کی بہت بڑی contribution ہے۔ انہوں نے موضوع کے اعتبار سے ماہیے کو وسعت ضرور دی ہے مگر اس کی اصلی شناخت کو مجروح نہیں ہونے دیا، بلکہ اس کی چال میں ایک بانکپن آ گیا ہے۔ میں ان کے ماہیوں سے بے حد لطف اندوز ہوا ہوں۔ Inspire بھی ہوا ہوں۔۔۔۔ **نیاز احمد صوفی**
> (مضمون بر ''محبت کے پھول'' مطبوعہ ماہنامہ ''قرطاس'' ناگپور ماہیا نمبر حصہ اول، مئی ۲۰۰۰ء)

حیدر قریشی بہ حیثیت نظم نگار

ڈاکٹر جمیلہ عرشی (جے پور)

جرمنی میں مقیم حیدر قریشی ویسے تو اردو کی معروف شخصیت ہیں اور نثر و نظم کے میدان میں اپنی اہمیت وعظمت ثابت کرا چکے ہیں۔انہوں نے مختلف اصنافِ ادب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔
شاعری میں بھی حیدر صاحب کی شخصیت مثلث کی حیثیت رکھتی ہے اور غزل، ماہیا، نظم کے زاویوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ مثلث ایسا ہے کہ جو نہ صرف ان کی شاعرانہ قدرتِ کلام کو ظاہر کرتا ہے بلکہ متنوع شخصیت کے پہلو بھی اُجاگر کرتا ہے۔اُن کی غزلیں پڑھ کر بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے، ماہیا نگاری میں وہ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں اور نظم گوئی میں بھی وہ بہر صورت کامیاب ہیں۔کس کو کس پر ترجیح دی جائے؟ اگر قاری کے سامنے یہ سوال کھڑا کیا جائے تو وہ پس و پیش میں پڑ جائے گا کیونکہ مثلث کے تینوں زاویے اُسے دلکش دکھائی دیں گے اور ہر زاویہء نظر سے حیدر قریشی کی تصویرِ عظمت کا پیکر بن کر اُبھرے گی۔اگر کسی نے ان کی غزلوں اور ماہیوں میں جذبات واحساسات کا سمندر نہیں دیکھا تو وہ اُن کی نظموں میں بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ بقول حیدر قریشی۔

"اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی"

حیدر قریشی نے بظاہر گنتی کی چند نظمیں لکھی ہیں جو ان کے مجموعہ ہائے کلام "عمرِ گریزاں" اور "دعائے دل" میں شامل ہیں۔تمام نظموں کو آزاد نظموں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے کیونکہ ردیف وقافیہ سے عاری ہیں۔تاہم ان میں وزن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔نظموں کے مطالعہ سے قاری اسیر حلقہء دام خیال ہو جاتا ہے کیونکہ شاعری کی بہت سی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ عام طور پر نظم نگار شعراء کا لب ولہجہ کھردرا ہوتا ہے اور ان کی نظموں میں ثقیل و نامانوس الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر لکھی گئی نظمیں تو ابہام وعلائم کا گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہیں۔مگر حیدر قریشی نے اپنی نظموں کو شائستہ،متوازن اور مہذب آواز سے آراستہ کیا ہے اور ان کا

شعری لہجہ بہت دھیما اور موثر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی شعری کائنات زندگی کے براہ راست تجربوں کی مرہونِ منت ہے اسلئے ہر نظم داستان حیات معلوم ہوتی ہے اور قاری کو متاثر کرتی ہے۔ایک نظم "درد" میں وہ پہلے مانوس لب ولہجہ میں کالے انجن کی سیٹی کی آواز٬ کسی تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک ٬بانسری کی دُکھی اور سُریلی صدا کی لفظی منظر کشی کرتے ہیں اور آخری بند میں یہ کہتے ہوئے گہرا تاثر چھوڑتے ہیں کہ۔۔۔۔۔

یہ ساری صدائیں مری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں ان سب کو پہچانتا ہوں
متاعِ فقیراں۔۔۔۔۔
یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں
درد
جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں!

غزل کی منتشر خیالی مشہور ہے لیکن نظم ایک مرکزی خیال لے کر آگے بڑھتی ہے۔ اپنی ہیئت، اپنے پیکر، اپنے موضوع٬ اپنے مفہوم کے لحاظ سے نظم میں تسلسل ہوتا ہے جو بالآخر اپنی منزل مقصود تک پہنچتی ہے۔حیدر صاحب کی سبھی نظمیں ایک طرح سے تھیم بیسڈ نظمیں ہیں جو بہت آسانی سے اپنے فوکل پوائنٹ تک پہنچ جاتی ہیں۔کہیں بھی غلط ترسیل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ایک مختصر نظم ’’منی پلانٹ‘‘ دیکھئے جس میں اُسلوب،لفظ، آہنگ، فارم، لَے وغیرہ سب بول رہے ہیں۔خود کلامی کی کیفیت نے اسے اور حسن بخش دیا ہے۔

زمین سے جُڑا رہوں
تو تب بھی لہلہاؤں میں
زمیں سے کاٹ کر مجھے
بوتلوں میں پانی بھر کے ڈال دو
تب بھی میں ہرا رہوں
پیرہی جمانے کی مجھے کہیں جگہ ملے

میں جہاں بھی جابسوں

وہیں ہرا بھرا رہوں

بلکہ میں جہاں رہوں

نصیب اُسکے جاگ آٹھیں

میں کوئی خشک شاخ تونہیں

کسی درخت کی!

زندگی نشاط وغم اور کیف والم سے عبارت ہے اور ایک جیتی جاگتی زندگی میں المیہ وطربیہ لمحات سے ہر شخص گزرتا ہے۔ ایک جینوئن تخلیق کار کی تخلیقات میں دیکھا جائے تو سارے "رس" پائے جاتے ہیں مگر بہر بہرحال "شر نگار رس" سب میں پردھان ہے جسکی کیفیت بہت مسحور کن ہوتی ہے اور ہر اچھا اور سچا تخلیق کار اسکی شدت کو محسوس کرتا ہے۔ حیدر قریشی بھی جمالیات کی پل صراط سے گزرے ہیں اور انہوں نے اپنی تخلیقات کو شر نگار رس کی سر مستیوں میں ڈبویا ہے۔ ایک نظم میں وہ اپنے محبوب سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:

تمہارے ان لب ورخسار کی سُرخی پہ

میری شاعری کے سب دمکتے رنگ بکھرے ہیں

طلسم حرف کے جو اسم بھی ہیں

سب تمہاری آنکھ کے جادو میں بستے ہیں

مرے مفہوم اور معنی تمہاری روح میں پنہاں

تمہیں پانے کی خواہش صرف خواہش ہی نہیں جاناں!

مجھے اپنے ادھورے پن کی بھی تکمیل کرنی ہے

اور آخر میں اس طرح قریب آنے کی دعوت دیتے ہیں:

سُنو جاناں!

اب اپنے حسن کے رنگوں سے میری شاعری بھر دو

اب اپنی آنکھ کے جادو کے سارے اسم مجھ پر

کھول کر

مجھ کو طلسم حرف کے اسرار سکھلاؤ

مرے معنی، مرے مفہوم بھی مجھکو عطا کردو

مرے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دو۔۔۔۔۔۔نزدیک آجاؤ۔

حیدر قریشی کی نظمیں یوں تو گوناگوں خصوصیات کی حامل ہیں مگر میری دانست میں انکی نظموں کا نمایاں خاصہ یہ ہے کہ ان کا اختتام ایک بھرپور تاثر انگیزی سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظموں کو اکثر چونکا دینے والے انداز میں ختم کرتے ہیں۔ قاری کو اچانک ایک حیرت افزا مقام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور اسکی تاثیر دوچند ہو جاتی ہے۔

پوری نظموں کے حوالے تو ممکن نہیں صرف چند نظموں کی اختتامیہ کیفیت ملاحظ فرمائیں:

میں اپنی آخری ہچکی پہ ہوں

اب جلد آجاؤ!

جو مجھ سے پیار بھی کرتا ہے اور دشمن بھی ہے میرا

عجب دشمن ہیں ہم دونوں

مگر یہ دل

یہ پاگل دل سمجھ میں ہی نہیں آئے

یہ دل ہے یا کوئی کردار اگلی داستانوں کا

ہوا ناگن سہی، ڈائن سہی لیکن

ہوا تو زندگی بھی ہے!

جب مری دوسری بہنیں بچھڑیں گی مجھ سے

میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دونگا۔

اور جبر کی اس ریت کو پامال کرا یسے

کہ دنیا پھر ابابیلوں کے ہاتھوں

ہاتھی والوں کی ہلاکت کا نظارہ دیکھ لے مالک!

حیدر صاحب کی نظموں کا ایک واضح انداز یہ بھی ہے کہ بیشتر نظموں میں خود کلامی کی کیفیت ملتی ہے۔وہ بڑی تہذیب شائستگی اور متانت سے اپنے ذاتی کرب کو عصری شعور سے ہم آہنگ کرتے ہیں اس طرح کی کئی نظمیں ہیں جن میں موصوف نے اپنی ذہنی کیفیات،قلبی واردات اور محسوسات کو سلیقے سے نظم کا روپ دیا ہے،رشتوں کے تقدس کو اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے اور قارئین کو اپنی سوچ وفکر کے سمندر میں غوطہ زن کیا ہے۔''میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا''۔''دعا گزیدہ''۔''ایک خواہش کی موت''۔''نصف سلور جوبلی''وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اپنے اختصار اور ارتکاز کے باعث اور اپنے اسلوب وموضوع کی بناء پر بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔کبھی وہ اپنی نظم کا آغاز کرکے ہوئے اس طرح منظر کشی کا حق ادا کرتے ہیں:

ہوا سفاک لہروں کی طرح

یخ بستہ تیروں سے مسلسل حملہ آور ہے

میں اپنے بند کمرے میں مسہری پر

رضائی لے کے بیٹھا ہوں

مری بیوی مرے پہلو میں بیٹھی ہے

شعیب،عثمان،ٹیپو،مانو،رضوانہ

ہمارے سامنے

پہلو بہ پہلو دائرے کی شکل میں بیٹھے

ہماری مورتیں ہم کو دکھاتے ہیں

ہمارا گم شدہ بچپن ہمارے سامنے

ان پانچ رنگوں میں چہکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

تو کبھی ا ساطیری کرداروں کو موضوع سخن بنا کر فکر وفن کی محفل سجاتے ہیں۔ان کی ایک نظم "تیامت"(Tiamat) ہے جو قدیم عراق میں سمیری دیو مالا کے مطابق ایک سمندری بلا تھی اور اپنی ہلاکت خیزی اور تباہی و بربادی کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔حیدر قریشی نے اس قیامت کو نظم کا جامہ اس طرح پہنایا

ہے۔

یہ سنتے تھے

سمندر سے نکل کر

وہ کبھی اوپر چلی آتی ہے

تو خشکی کے مکینوں کے لیے

ویرانیاں،بربادیاں لاتی

وہ مظہر تھی،ہلاکت اور تباہی کا

سبھی مجبور لوگوں پر ستم ڈھاتی

سبھی مقہور لوگوں سے کراتی

احترام اپنا،وہ جابر

قوت وطاقت پہ نازاں

نشۂ تقدیس میں

ڈوبی ہوئی جب

جھومتی جاتی

ہلاکت اور بربادی کے منظر پھیلتے جاتے

یہ سنتے تھے،مگر اب دیکھتے بھی ہیں

کئی صدیوں تلک سوئی ہوئی،کھوئی ہوئی

جابر تیامت جاگ اٹھی ہے

ہلاکت خیز قوت اور عظمت کے نشے میں جھومتی

جابر تیامت ساحلِ مغرب سے نکلی ہے

سمیری سرزمیں کو اب کے اس نے

صرف خشکی اور پانی ہی نہیں

ساری فضا سے،ہر طرف سے،ہر جگہ سے

گھیر رکھا ہے!

بلاشبہ حیدر قریشی ہماری موجودہ نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔غزل میں ان کی فکر اگر عروج پر ہے تو نظم میں بھی فکری بلندیاں نمایاں ہیں۔مجموعی طور پر اُن کے کلام میں زندگی کی رمق دمق اور تاب وتوانائی ہے اور انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کو پُر وقار لہجے میں پیش کیا ہے۔مشکل تو یہ ہے کہ اُن کی نظموں پر صرف تبصرے سے کوئی بات نہیں بنتی، یہ صرف پڑھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مگر یہ دل یہ پاگل دل سمجھ میں ہی نہیں آئے

یہ دل ہے یا کوئی کردار اگلی داستانوں کا!

حیدر قریشی کی نظمیں ان کی غزل ہی کا پرتَو ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں سے بعض نہایت تاثیر کی حدّت دیتے ہیں۔الفاظ کی نشست و برخاست سے لگتا ہے کہ ان کے ہاں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ موجود ہے۔۔۔۔ان میں ایک انسان کی پوری زندگی کا عکس ملتا ہے۔۔۔۔''دعا گزیدہ''اس خوف کا دبا دبا سا اظہار ہے جو انسان پر ہمہ وقت طاری رہتا ہے۔یہ ایسا خوف ہے جو کبھی انسان کے دل سے نہیں نکلتا۔اس دنیا میں وہ لوگ جن سے آدمی کے خون کے رشتے ہوتے ہیں' کسی موڑ پر بچھڑنے لگتے ہیں تو اسے دنیا کی بے ثباتی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔اس نظم میں ماں' باپ کی مفارقت کے دکھ بھی لہراتے ہیں اور موت کا ایک نادیدہ خوف بھی۔مگر ان کا یقین انہیں ہر قدم پر ڈھارس دیتا ہے کہ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے۔''ایک خواہش کی موت'' بھی اسی سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔وہ آنسو جوان کی آنکھوں میں موجزن ہیں وہ انہیں ہمیشہ بے کل اور مضطرب رکھتے ہیں۔خواہشیں انسان کو مارتی بھی ہیں اور بعض اوقات مرنے سے بچا بھی لیتی ہیں۔

''تخلیق در تخلیق''اسلوب اور معنویت کے اعتبار سے حیدر قریشی کی نہایت اہم اور فکر انگیز تخلیق کہی جا سکتی ہے جس میں خالق اور بندے کا ازلی رشتہ مختلف دھاگوں سے بندھا ہوا ملتا ہے۔نظم میں حسرت بھی ہے اور امید کی کو ملتائیں بھی۔اور قدرت کی اَن گنت صناعیوں کا اعتراف بھی۔امکان اور یقین بھی اس میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''دعا''ایک ایسے منظر کی قوسیں بناتی ہے جس میں امیدوں اور تمناؤں کا ایک وسیع جہاں آباد ہے۔اس میں ایک تفاخر بھی ہے اور بے بسی کا دکھ بھی۔سورۂ فِیل کے پس منظر میں لکھی گئی چند آس بھری سطریں اس نظم کی جان کہی جا سکتی ہیں۔------------------------------**ہارون الرشید**

(مضمون ''غزلیں، نظمیں، ماہیے''از ہارون الرشید۔مطبوعہ دو ماہی ''گلبن''احمد آباد شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۰۱ء)

حیدر قریشی کی غزل
بھیڑ سے الگ

ڈاکٹر محبوب راہی (سابق پرنسپل جی این کالج۔انڈیا)

حیدر قریشی سے میری پہلی ملاقات بیسویں صدی کی آٹھویں دَہائی کے اختتامی برسوں میں ہوئی۔ان دنوں مجھے دلّی میں محترم مظفر حنفی صاحب کے دولت کدہ پر چند روزہ قیام کی سعادت حاصل تھی۔ان کے مطالعہ کی میز پر دنیا بھر کے اردو رسائل' جرائد اور تازہ ترین مطبوعات کا ہمہ وقت ڈھیر لگا رہتا تھا۔صوری نقاہت اور معنوی ضعف میں مبتلا دائم المریض' مدقوق ہندوستانی رسائل کے بالمقابل پاکستان سے موصولہ ڈاکٹر وزیر آغا کے''اوراق''اور احمد ندیم قاسمی کے''فنون'' کے ساتھ حیدر قریشی کے''جدید ادب'' کی ہر پہلو قابل رشک صحت مندی' تنومندی اور توانائی اپنے میں ایک عجیب مقناطیسیت رکھتی تھی۔ان میں''جدید ادب'' سے پہلی بار متعارف ہونے کی بناء پر اس کے مشمولات کے نئے ذائقے اور تنوع نیز طرز پیش کش کی ندرت کشش کا سبب تھی۔یہی میری پہلی ملاقات تھی حیدر قریشی سے۔پھر یوں ہوا کہ گزشتہ کم وبیش تین دہائیوں پر محیط تخلیقی سفر کے دوران ہر منزل' ہر پڑاؤ اور ہر موڑ پر ان کی ہمہ رنگ' مختلف الجہات تخلیقات کے وسیلے سے ملاقاتوں کے خوشگوار حادثات پیش آتے رہے۔کبھی''گلبن''احمد آباد میں ان کی کھٹی میٹھی یادوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل رہی' کبھی ''اسباق''پونہ میں بالخصوص اور ہندو پاک کے کم وبیش سبھی رسائل وجرائد میں بالعموم ان کے نظم ونثر پر مبنی کم وبیش تمام مروجہ اور چند متروکہ اور نو آمدہ اصناف ادب پر ان کی تازہ کارنگارشات کے حوالے سے ان کے تخلیقی سفر میں کبھی چند قدم اور کبھی دور تک ان کی ہمسفری مجھے حاصل رہی۔ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب سے ان کی چند تخلیقات سے سرسری گزرا جبکہ مزاج سے عین مطابق ہونے کی بناء پر بیشتر نے میرے دامنِ توجہ کو دیر تک تھامے رکھا' بالخصوص''میری محبتیں''میں شامل ان کے دلچسپ' دلکش اور اثر آفریں خاکوں' خود نوشتوں اور تنقیدی و تحقیقی

مضامین کے علاوہ رسائل میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ شائع ہونے والے ان کے نو بہ نو موضوعات پر ادبی، تخلیقی اور تنقیدی نظریات کے ترجمان ان کے پُر مغز، مدلل اور مبسوط طول طویل خطوط۔ مدیر ''اسباق'' نذیر فتح پوری اور مدیر ''گلبن'' سید ظفر ہاشمی صاحبان (جن سے مخلصانہ مراسم میری ادبی خوش بختی کا موجب ہیں) کی زبانی ان کی ادبی فتوحات کی اطلاعات نیز مختلف اصناف شعر و ادب پر مبنی ان کی کم و بیش ایک درجن سے زائد تصانیف کی مرعوب کن فہرست'۔ ان تمام عوامل کے اشتراک سے میری نظر میں حیدر قریشی کی ادبی شخصیت خاصی پُرکشش، قد آور اور جاذبِ قلب و نگاہ رہی ہے۔ اب یہاں نہ تو اسکا موقع و محل ہے اور نہ ہی اس برق رفتار سفر روز و شب میں اتنی مہلتیں اور ایسی فرصتیں نصیب ہیں کہ حیدر قریشی کی متذکرہ تمام حیثیتوں پر تجزیاتی تفصیلات یکجا کی جائیں' کہ یہ کام ان پر تحقیقی کام کرنے والے پی ایچ ڈی کے اسکالرز کا ہوگا۔ مجھے تو فی الوقت ان کی غزلیہ شاعری پر سرسری بات کرنی ہے' جو بیشتر اردو شعراء کی طرح مجھے بھی از حد محبوب اور مرغوب نیز میری خصوصی توجہ کا مرکز و محور رہی ہے۔

شاعری کی طرح نثر میں بھی چند اصطلاحات' کچھ فقرے کثرت استعمال سے گھس پٹ کر اپنی معنویت' پہلو داری اور چمک دمک کھو چکے ہیں جس طرح چند ایک استثنائی صورتوں سے قطع نظر کم و بیش ہر اردو شاعر کے تعلق سے لکھا جاتا ہے کہ ''وہ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے''۔ میں اپنے علم و آگہی کی روشنی میں نہایت اعتماد اور وثوق کے ساتھ اس روشن حقیقت کی نشاندہی کرنا چاہوں گا کہ ستیہ پال آنند کی طرح ایک دو کو چھوڑ' اردو کا ہر شاعر بنیادی طور پر غزل ہی کا شاعر ہوتا ہے کیونکہ غالبؔ کے ایک شعر میں خفیف سے تصرف کے ساتھ: ہر چند ہو غزل کے مٹانے کی گفتگو بنتی نہیں ہے شعر غزل کے کہے بغیر اردو کے کسی باشعور شاعر کے لئے غزل سے مفر ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا جس طرح اردو کا ہر اچھا اور سچّا شاعر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوتا ہے' حیدر قریشی بھی ہیں جبکہ ان کی فتوحات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کی کثیر الجہات تخلیقات کی رنگا رنگی کے آگے قوس قزح کے رنگ ماند ہیں۔ تخلیقی نثر میں افسانے' خاکے' یادداشتیں' سفرنامہ' خودنوشت' انشائیے' تنقید کے تحت ماہیا نگاری کی تحریک اور دیگر کئی نئے پرانے' متفقہ اور متنازعہ موضوعات پر منفرد انداز نقد و نظر کے حامل فکر انگیز مضامین' تحقیق کے باب میں مختلف عہد ساز علمی و ادبی شخصیات پر سوانحی مضامین اور شعر و ادب کے مختلف النوع عنوانات پر نئی جہتوں کا پتہ دینے والے مضامین جیسے کئی متضاد اور متخالف نثری موضوعات پر تصانیف نو بہ نو کے انبار لگانے والے حیدر قریشی نے شاعری کے میدان میں بھی بہر سمت اپنے کمالات کے پرچم نصب کئے ہیں۔ وہ حسب روایت بنیادی طور پر غزل کے شاعر تو ہیں ہی' اردو شاعری کی بعض دیگر قدیم و جدید اصناف میں ان کا تخلیقی سرمایہ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے خاصا

وقیع ہے۔ بالخصوص مروجہ اصناف شاعری میں شاید ہی کوئی صنف حیدر قریشی کی دسترس سے دور رہی ہو۔ آزاد اور پابند نظم' ماہیا' حمد و نعت اور مناجات' آزاد غزل' دوپدے' غرضیکہ ہمہ اقسام کے گلہائے رنگا رنگ سے حیدر قریشی نے اپنے چمن سخن کی زینت کر رکھی ہے جو ان کے ذہنِ رسا کی زرخیزی اور فکر و نظر کی شادابی کی روشن علامتیں ہیں۔ بالخصوص ماہیا جو اردو شاعری میں نئے نئے امکانات کے ساتھ داخل ہو رہا ہے اس کے سربراہوں میں نذیر فتح پوری اور مناظر عاشق ہرگانوی کے ساتھ (بلکہ ان سے کچھ زیادہ) حیدر قریشی کا نام بھی نمایاں ہے۔ ان کے خالصتاً ماہیوں کا ایک مجموعہ ''محبت کے پھول'' مشترکہ شعری مجموعہ ''عمرِ گریزاں'' میں بھی ان کے ماہیے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ''اردو میں ماہیا نگاری'۔ ''اردو ماہیے کی تحریک'' اور ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' ان کی تین مستقل تحقیقی نثری تصانیف سے صنف ماہیا سے ان کی ذہنی ہم آہنگی اور فطری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔

بات تو مجھے حیدر قریشی کی غزل پر کرنی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ان کی متذکرہ بالا کثیر الجہات ادبی' تخلیقی سرگرمیوں سے یکسر صرف نظر کر جانا بھی ممکن نہیں۔ خیر!۔۔ تو جب بات غزل کی ہوتی ہے' ان تمام محرکات و عوامل کا اجمالی تذکرہ بھی ناگزیر ہو جاتا ہے جو غزل کی کم و بیش تین سو سالہ تاریخ کو تابنا کی' رنگا رنگی اور استحکام عطا کرنے کا موجب ہیں۔ اس کا یہ مختصر دور حیات نہ جانے کتنے سرکاری' سیاسی' سماجی' معاشی' معاشرتی نیز تہذیبی اور ثقافتی تغیرات سے گزر چکا ہے۔ مغلوں' مراٹھوں' انگریزوں' دیسی راجوں' مہاراجوں' نوابوں' جاگیرداروں کے ادوار اقتدار' فارسی ایرانی اور اسلامی روایات' دیومالائی اساطیر سے متعلق لفظیات' علامات اور تلازمات سے آراستہ و پیراستہ غزل نے نو بیاہتا دلہن کے روپ میں ہندوستانی اردو کی دہلیز پر قدم رکھا اور بس یہیں کی ہو رہی۔ مشترکہ ہندوستان کی آب و ہوا اور ماحول اسے خوب خوب راس آیا۔ اس کی دوشیزگی' اس کے جوبن پر خوب خوب نکھار آیا۔ کلاسیک' رومانیت یا روایت میں جس سے غزل کا بنیادی خمیر تیار ہوا ہے' اپنی جلوہ آرائیوں اور حشر سامانیوں سے سرکاروں' درباروں اور چھوٹی بڑی نجی اور عوامی محفلوں کو مسحور و مخمور کرنے کے بعد جب بالعموم دنیا بھر میں اور بالخصوص ہندو پاک میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ بلند ہوا تو اردو غزل بھی اس تحریک کے شانہ بشانہ اگلے محاذوں پر پیش قدمی کرتی نظر آئی۔ اس کے اشعار نے تحریک کی لَے کو بلند آہنگی اور گھن گرج عطا کی۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد جب تحریک ماند پڑ گئی اور جدیدیت نے اپنے ابہام زدگی' اہمال نگاری' ژولیدگی' پیچیدہ علامتی طرزِ اظہار' شکست ذات' یاسیت' کرب وجود' محرومی' بے سکونی' تشکیک' لاسمتیت' رشتوں ناطوں کی بے حرمتی' قدروں کی شکست و ریخت' ریاکاری' منافقت جیسے جلتے سلگتے مسائل میں گھرے انسان کی تنہائی کا المیہ' فرد کی بے شناختی کا نوحہ وغیرہ وسائل اظہار کے ساتھ اردو غزل کی مملکت پر اپنا تسلط جمایا اور تقریباً دو دہائیوں تک مملکت شعر و ادب پر ا

سکے دورِ حکمرانی میں اردو غزل نے مکمل خود سپردگی اور کامل معاونت کا برتاؤ اس کے ساتھ روا رکھا۔ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں تجربوں سے ثابت ہوا کہ اردو غزل جس کی جڑیں صدیوں پر محیط دیرینہ روایت کی گہری تہوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں' اپنی خوش طبعی' ملنساری اور بھائی چارگی کے لازوال جذبوں کے تحت ہنگامی محرکات' عارضی نظریات اور ہنگامی تقاضوں کا ساتھ تو دے سکتی ہے لیکن اپنی بنیادی شناخت کے مکمل تحفظ کے ساتھ۔لہٰذا اردو شعروادب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ حالات کے تغیر وتبدل اور واقعات کی اتھل پتھل کے نتیجے میں متذکرہ بالا ہنگامی' عارضی' موسمی اور وقتی نظریات (ترقی پسندی اور جدیدیت) کی ترجمانی کا حق اردو غزل نے ترسیل وابلاغ کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ کما حقہ ادا کر دیا۔ترقی پسندی کے دور میں نعرہ بازی بھی زور شور سے کی تو جدیدیت کے ابہام اہمال اور علامت نگاری کو بھی اپنے اندر سمو کر اسے حرارت آشنا کیا۔لیکن اوپر سے اوڑھے ہوئے یہ نظریات اس کے وجود کا حصہ نہیں بن پائے۔اس کی بنیادی اور فطری شناخت کے خدوخال میں سرمو فرق نہیں آیا۔اب کہ جدیدیت کے عارضی فیشن سے لوگ اوب چکے ہیں اور فطری تقاضوں کے زیر اثر پھر سے اپنی گم گشتہ روایت کی جانب مراجعت کر رہے ہیں' چند فیشن زدہ اس مراجعت پر مابعد جدیدیت کا مضحکہ خیز لیبل چسپاں کرنے پر مُصر ہیں۔ان کے ساتھ وہ نام نہاد تخلیق کار بھی جو ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دیر چلتے ہوئے بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔لیکن وہ باشعور صاحبِ بصیرت تخلیق کار جنہیں فطری صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں اس عارضی بھیڑ بھاڑ میں اپنی منفرد تخلیقی شناخت کو گم ہونے سے بہر صورت محفوظ رکھتے ہیں۔نئی آواز' نئے لہجے' نئے نظریے کو لبیک ضرور کہتے ہیں لیکن اپنی آواز' اپنے لہجے اور اپنے نظریے کے مکمل تحفظ کے ساتھ۔نگاہ دوررس کے حامل ایسے فن کاروں میں حیدر قریشی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

حیدر قریشی ایک کثیر المطالعہ' وسیع النظر' کشادہ ذہن' پختہ فکر اور تازہ کار تخئیل کے حامل ایک باشعور تخلیق کار ہیں۔اپنے گردو پیش' قریب و بعید' زندگی کے داخلی اور خارجی عوامل' گوناگوں تجربات' روزمرہ درپیش واقعات' خوشگوار و ناخوشگوار حادثات وسانحات' مختصر یہ کہ حیات ومما ت سے متعلق لوازمات جن سے وہ گزرتے رہے ہیں' جنہیں وہ جھیلتے رہے ہیں' کم وبیش ان تمام کیفیات کو ان سے پیدا شدہ نتائج کے ساتھ اشعار میں سمو لیا ہے۔ان کی غزل رنگینئ تخیّل کا محض نگار خانہ نہیں' جیتی جاگتی زندگی کے رنگارنگ حقائق کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔

انہوں نے اپنے غزلیہ اشعار کے وسیلے سے نامعلوم خلاؤں میں محض الفاظ وخیالات کے طوطا مینا اڑانے کے بجائے زندگی کی رگوں میں دوڑنے پھرنے والے' زندگی کی اوبڑ کھابڑ سطح پر رواں دواں تلخ وترش اور کھٹے میٹھے حقائق کی اثر انگیز ترجمانی کی ہے۔انہیں دنیا سے جو کچھ ملا ہے اسے لوٹانے کے بجائے اس کے ردوقبول کی مشترکہ

کیفیت کو ایک دلکش طرزِ اظہار کے وسیلے سے دنیا کے روبرو پیش کر دیا ہے۔وہی سب کچھ جسے شاعری کی اصطلاح میں سماجی بصیرت اور عصری حسیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔حیدر قریشی کے دامن نگاہ میں کائنات کی اتنی وسعتیں سمٹ آتی ہیں جن کی سمائی کی تنگنائے دل میں گنجائش نہیں ہے۔

پھر اس کو دامنِ دل میں کہاں کہاں رکھیں
سمیٹ سکتے ہیں جو کائنات آنکھوں میں

بصارت اور بصیرت تک حیدر قریشی کی آنکھوں کا سفر جن تجربات سے دوچار ہوتا ہے اظہار نو بہ نو کے وسیلے سے ان تجربات کو انہوں نے گویائی عطا کر دی ہے۔مثلاً

آنکھ کس طرح کھلے میری کہ میں جانتا ہوں   آنکھ کھلتے ہی سبھی خواب اُجڑ جاتے ہیں
عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں   سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں
وہ بھی اپنے آئینے میں دیکھتا ہوگا مجھے   جس کو اپنے آئینے میں دیکھتا رہتا ہوں میں

خوابوں کے اجڑ جانے کے اندیشے سے آنکھیں نہ کھولنا' کرب و بلا کی رات میں لبوں پر سسکتی پیاس اور آنکھوں میں فرات کا موجیں مارنا نیز آئینۂ خیال میں اپنے محبوب کو دیکھتے ہوئے اس خوش فہمی میں سرشار رہنا کہ وہ بھی اپنے آئینۂ ذات میں مجھے دیکھتا ہوگا' کیسے دلکش' نادر خیالات' کیسے تازہ بہ تازہ منفرد اور اَن چھوئے تجربات ہیں اور پھر اس پر حیدر قریشی کے طرزِ بیان کی رنگینی و رعنائی سونے پر سہاگہ کے مصداق ہے۔تخیّل کے ایسے اَن دیکھے اچھوتے اور منفرد پیکروں سے حیدر قریشی کی غزلیہ شاعری بھری پڑی ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کیجئے

ایک اَن دیکھے کی سوچوں میں گھِرا رہتا ہوں میں   اس کی آنکھیں' اس کا چہرہ سوچتا رہتا ہوں میں
شاخِ دل یوں تری یادوں سے ہری رہتی ہے   جیسے میووں سے کوئی ڈال بھری رہتی ہے
تمام روشنیاں' خوشبوئیں بجا حیدرؔ   پر اُس گلاب بدن سا کوئی ہوا بھی نہیں
نہ پورا سوچ سکوں' چھو سکوں' نہ پڑھ پاؤں   کبھی وہ چاند' کبھی گُل' کبھی کتاب لگے
زباں ایسی کہ ہر اک لفظ مرہم سا لگے اس کا   نظر ایسی کہ اُٹھتے ہی دلوں میں تیر ہو جائے

بصری' لمسی' سمعی اور شامّی' ان حسی پیکروں کی لہکتی' مہکتی اور چمکتی' دمکتی ان خوبصورت اور منفرد مثالوں میں حیدر قریشی کے تخیّل کی نادرہ کاری' اظہار کی دلکشی' الفاظ کی خیال کی ہم رشتگی اور برجستگی' زبان کی پاکیزگی' بیان کی شائستگی' اظہار کی شگفتگی' لہجے کی شستگی جیسے محاسن کی روانی اور فراوانی کا پتہ ملتا ہے۔یہ اور ایسے ہی بیشتر شعری محاسن دراصل ہماری اس بے بہا اور لافانی روایت کا ورثہ ہیں جنہیں تاجرانِ فکروفن نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی

ہنگامہ خیزیوں میں وقت کے چلن، بازار کے رُخ اور گاہکوں کی مانگ دیکھ کر ردّی کی بوریوں میں باندھ کر گوداموں میں ڈال رکھا تھا۔

پچھلی سطروں میں عرض کر چکا ہوں کہ ترقی پسندی کے مداری کا تماشہ ختم کرنے، مغرب سے مستعار جدیدیت کے جھنڈے لپیٹ لینے کے بعد ان دونوں کے لاؤلشکر کی اڑائی گرد و غبار کو بدلتے ہوئے رجحانات کی تازہ بہ تازہ ہوائیں اپنے ساتھ اڑا لے گئیں۔ مطلع شعر و ادب صاف ہو گیا اور اس پر کلاسیکی روایت کے چاند ستارے پھر اسی آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگے۔ ازل تا ابد مستقل اور مسلسل جاری و ساری رہنے والا یہ فطری عمل دراصل ہماری روایت گم گشتہ کی بازیافت ہے۔ وقتی گمرہی سے صحیح سمتوں کی جانب مراجعت ہے جسے ادب میں نقد و بصیرت کے نام پر کاروبار سیاست چلانے والے نعرہ باز تاجروں نے اپنی دوکانوں کے پرانے سائن بورڈوں پر رنگ و روغن پوت کر جلی حروف میں ''مابعد جدیدیت'' پینٹ کروالیا۔

اس تمام تر تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ حیدر قریشی ایک صاحبِ فہم و ادراک شاعر ہیں۔ اپنے شاندار اور جاندار ماضی کے عظیم الشان ورثہ کے امین ہیں۔ ان پر یہ حقیقت خوب روشن ہے کہ اردو شعر و ادب کے عظیم القدر ذخیرے میں زندگی، پائیداری، جاودانی، دوام اور استقامت انہیں تخلیق پاروں کو حاصل ہوتا ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل داخلی و خارجی عوامل، انسانیت کی تشکیل و تعمیر میں کار آمد پاکیزہ فطری جذبات اور قلب و ذہن کو متحرک کرنے والے لافانی انسانی احساسات، نیز فطری رجحانات کو بیدار کرنے کا بنیادی فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ان تمام محرکات و عوامل کی رگوں میں گرم حیات آفریں لہو بن کر جو لافانی جذبہ رواں دواں ہے وہ جذبۂ عشق ہے جس پر نظام کائنات کی اساس ہے۔ عشق حیدر قریشی کی شاعری کی بنیادی شناخت ہے جو مختلف شکلوں میں ان کے غزلیہ اشعار میں جھلکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدرؔ — مجھ پہ جو شاعری اتارتا ہے

چلو ہم عشق کی اک اور داستان بنیں — وہ اگلے عشق کے قصے تو اب فضول ہوئے

جو اس کے وصل کے حق دار ٹھہرے اور تھے حیدرؔ — ہمیں تو صرف اس کے عشق میں بدنام ہونا تھا

چلو ہم بے سلیقہ ہیں مگر یہ بھی تو بتلاؤ — سلیقہ عشق کا پھر اور کس کے پاس باقی ہے

کون ہے جو رُوح میں میری سرایت کر گیا — رات دن کس کے خیالوں میں پڑا رہتا ہوں میں

حیدرؔ کے یہاں تذکرۂ عشق محض برائے تذکرہ نہیں۔ بقول ان کے

یونہی تُک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدرؔ — بِھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

لہٰذا ان کے یہاں عشق کا تذکرہ محض روایت کی خانہ پُری کے بجائے مکمل عشق اپنی فطری حرارتوں، اپنے تمام تر جذباتی محرکات کے ساتھ زندگی کے روزمرہ عوامل کی طرح کارفرما ہے۔ ان کا معشوق روایتی غزل کا خیالی ہیولیٰ نہیں۔ ان کی اپنی دنیا کا، ان کے اپنے گرد و پیش کا رہنے سہنے والا، گوشت پوست کا حسین انسانی پیکر، تمام تر جسمانی حقیقتوں نیز جذباتی سچائیوں کا دلکش مرقع ایک جیتا جاگتا، جانا پہچانا وجود ہے۔ حیدر قریشی کے غزلیہ اشعار میں یہی جیتا جاگتا زمینی معشوق ہے جس کا حقیقت پسندانہ تذکرہ ان کی غزل کو بھیڑ سے الگ کرتا ہے۔ بطور ثبوت چند اشعار ملاحظہ کیجئے

وہ بھید وہ اسرار کھلے مجھ پہ بدن کے — دنیا میں ابھی تک جو کسی نے نہیں دیکھے

نارسائی کی اذیت ہی رہی اپنا نصیب — مل گئیں روحیں تو جسموں کو جدا رکھا گیا

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں — سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

تمام روشنیاں، خوشبوئیں، بجا حیدرؔ — پر اُس گلاب بدن سا کوئی ہوا بھی نہیں

استعارے تو کجا سامنے اس کے حیدرؔ — شاعری ایک طرف اپنی دھری رہتی ہے

سبھی استعارے، علامتیں بھی بجا ہیں اس کے لئے مگر — وہ تو آپ اپنی مثال ہے، وہ تو آپ اپنی دلیل ہے

بدن کے اسرار کھلنا، روحوں کے ملن کے باوجود جسموں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا، ساری روشنیوں اور خوشبوؤں کا کسی گلاب بدن کے بالمقابل بے حقیقت ہونا، جسم میں کئی موسموں کی مہک سے سانسوں کی تیز آنچ میں جلنا، استعارے تو کجا معشوق کے سامنے تمام شاعری کا ایک طرف دھرا رہ جانا، تمام استعاروں اور علامتوں کی برجستگی اور معنویت کے باوجود کسی کا اپنی مثال آپ، اپنی دلیل آپ ہونا۔ ایسے ایسے تازہ کار استعارات، نادر تشبیہات اور تاثر انگیز کیفیات حیدر قریشی کی غزل کو ہم عصر غزل میں ایک مقام امتیاز و افتخار عطا کرتی ہیں۔ حقیقی جذبۂ عشق اور معشوق کے جیتے جاگتے جسمانی وجود کے باہم اتصال سے جذبوں کی جو حلاوت اور امنگوں کی جو حرارت غزل کے اشعار میں سرسراتی ہے، حیدر قریشی کی غزل سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر — محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

اس کے ہونٹوں پہ میں پھر مہکوں تمنّا بن کر — پھر وہ چاہت جو کبھی اس نے تھی چاہی، مانگوں

وہ مسکرا کے پوچھتے تھے مدعائے دل — اور اپنے منہ میں جیسے زباں بھی نہیں رہی

اس نے آنا ہی نہیں تھا اس محلے کی طرف — ہم سجاتے ہی رہے بے سود گھر کے راستے

دل کے دروازے پہ دستک دے کے چھپ جاتا ہے وہ — اور اپنے سامنے حیدرؔ کھڑا رہتا ہوں میں

تُو جس کے لئے خود کو بھلا بیٹھا تھا حیدرؔ　　کیا اس نے بھی بھولے سے تجھے یاد کیا تھا

ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے　　پھر مِرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی

یاد کے مُرجھائے پھولوں میں تازگی محسوس ہونا' ہونٹوں پر تمنا بن کر مہکنا' مدعائے دل پوچھنے پر بے زبانی' کسی کے آنے کا یقین نہ ہوتے ہوئے گھر کے راستوں کا سجانا' دل کے دروازے پہ دستک دے کر کسی کا چھپ جانا' بھولنے والے کی یاد میں خود کو بھلا بیٹھنا' ایک قصے میں دوسری کہانی کا آ جانا' سیدھے سچے عشقیہ جذبات اور معاملات کی یہ کیفیات نہایت پُر اثر اور اچھوتی ہیں۔ یہ تمام تر محسوسات فطری جذبات کے عین مطابق اور معمولاتِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ اس پر حیدر قریشی کے طرزِ اظہار کی ندرت اور دلکشی مستزاد ہے۔ حیدر قریشی کی کلاسیکی روایت سے وابستگی کا مطلب اندھی تقلیدیت یا محض کوری روایت پرستی نہیں' وہ نئے عہد کے نئے ذہن اور نئی فکر و نظر کے حامل ایک نئے تخلیق کار ہیں۔ وہ نئے شعر میں نئے انداز سے نئی بات کہنے پر قادر ہیں کہ انہیں معلوم ہے پرانے شعراء میں پرانی بات کس انداز سے کہی گئی ہے۔ وہ جدید نسل سے متعلق ہوتے ہوئے اپنی شعری روایت سے بھی یکسر غیر متعلق نہیں ہیں۔ ان پر یہ حقیقت روشن ہے کہ روایت سے مکمل انقطاع شاعر کی تخلیقی موت کے مترادف ہے۔ لہٰذا انہوں نے روایت سے مکمل اور مستحکم وابستگی کے ساتھ عصری حسیت اور سماجی معنویت کے ترجمان ایسے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو شعر تخلیق کئے ہیں جو روایت اور جدیدیت کی خوشگوار آمیزش سے نئے ذائقوں' نئی نئی خوشبوؤں اور اچھوتے لمس کے مرقعوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

آج کل اُس کی ہوائیں اور فضائیں اور ہیں　　ایسے لگتا ہے کہ دھرتی آسماں ہونے کو ہے

انتہائے اجنبیت میں وہ آیا ہے مقام　　اجنبی سارے کے سارے جانے پہچانے لگے

جسے سمجھتے تھے صحرا وہ اک سمندر تھا　　کھلا وہ شخص تو ہم کیسے آب آب ہوئے

اندر کی دنیائیں ملا کر ایک نگر ہو جائیں　　یا پھر آؤ مل کر ٹوٹیں اور کھنڈر ہو جائیں

اُگ رہا تھا درخت سورج کا　　جب ستاروں کو بو رہا تھا وہ

جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا　　سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا

کنارِ آب حیدرؔ اپنا منہ لئے کھڑے رہے　　گھڑے کے بدلے کار میں وہ پُل سے پار ہو گئے

اس زندگی کی ساری حقیقت ہے اک فریب　　ہم تَیرتے رہیں گے سرابوں کی جھیل میں

سزا یوں مل رہی ہے مجھ کو میرے نیک عملوں کی　　گنہ سب میرے حصے کے مرا ہمزاد کرتا ہے

وجود میرا اگر اُس پہ منکشف ہو جائے　　مجھے یقین ہے وہ خود سے منحرف ہو جائے

شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر　　جب ترے شہر سے یہ شہر بدر آئے تھے

سمندروں کی جگہ دشتِ بے کنار دیا　　الٰہی! کشتیٔ جاں کو کہاں اتار دیا

عصرِ حاضر کے لمحہ بہ لمحہ درپیش تغیرات دیکھ کر زمین کو آسمان ہوتے محسوس کرنا' اجنبیت کی انتہا میں ہر اجنبی کا جانا پہچانا لگنا' صحرا نما شخص کو سمندر جیسا پا کر آب آب ہونا' اندر کی دنیائیں ملا کر ایک ہو جانا یا ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو جانا' ستارے بونے کے وقت سورج کا اُگ آنا' ذات میں سمٹ کر سمندر کی طرح پھیل جانا' جدید دور کی سوہنی کا گھڑے کے بجائے کار میں بیٹھ کر پُل پار کرنا' سرابوں کی جھیل میں تیرتے ہوئے زندگی کے حقائق کا ادراک ہونا' نیک اعمال کی سزا میں ہمزاد کا گناہوں کا ارتکاب کرنا' کسی کے وجود کا انکشاف خود سے انحراف کا موجب ٹھہرنا' دھرتی کا شہر بدروں کے قدم چومنا' سمندروں کے بجائے دشتِ بے کنار میں کشتیٔ جاں کو اتار دینے پر خدا سے شکوہ' زندگی کے معمولات' روزمرہ تجربات' جانے پہچانے واقعات اور دیکھے بھالے حالات کو نئی لفظیات' اچھوتی ترکیبات' منفرد تشبیہات اور نادر استعارات کو وسیلۂ اظہار بنا کر اشعار کے پیکر عطا کرنے کا فن حیدر قریشی کو خوب آتا ہے جس کی شہادت مذکورہ بالا اشعار دیتے ہیں۔

زندگی سے کچھ اور زیادہ قریب تر' زمین کی سطح سے لگ کر چلتے ہوئے' بات چیتی انداز اور بے ساختہ پن لئے ہوئے حیدر قریشی کے یہ قطعی گھریلو قسم کے چند اشعار جو ان کے ذاتی محسوسات اور عقائد کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

اپنا نہیں تو بچوں کا احساس کر ذرا　　حیدرؔ ادب کو چھوڑ کے فکرِ معاش کر

حیدرؔ اب اپنی عادتیں' اطوار ٹھیک کر　　ابا بھی چل بسے' تری ماں بھی نہیں رہی

بے خانماں یہ شخص کہ حیدرؔ ہے جس کا نام　　اے ارضِ پاک! دیکھ لے تیرا ہی لال ہے

وہ حساب تو لے گا' پر حساب کیا دیں گے　　ہم گناہگاروں کو کب حساب آتا ہے

چلو پھر ابلیس کو بلاؤ اسے بتاؤ　　جو ابنِ آدم پھسل گیا تھا' سنبھل رہا ہے

ذرا خوفِ خدا حیدر قریشی!　　یہ کیسے شعر فرمانے لگے ہو

بیٹھے بیٹھے ہی جو اتنے شعر حیدرؔ ہو گئے　　اس کا مطلب ہے طبیعت پھر رواں ہونے کو ہے

دل میں خوفِ خدا لئے طبیعت کی روانی کے ساتھ بیٹھے بیٹھے نو بہ نو خیالات پر مبنی ایسے ایسے منفرد اور نادر اشعار کے انبار لگاتے رہنے والے حیدر قریشی جن کا نام ہم عصر افقِ شعر و ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے' ابھی شہرتوں کے نت نئے آفاق پر چاند سورج کی طرح درخشاں ہونا ہے۔ انہیں ابھی عزّ و وقار کی کئی بلندیاں سر کرنی ہیں' جس کی پیش قیاسی ان کی تخلیقی رنگارنگیوں اور فنی و فکری جولانیوں کی روشنی میں بآسانی کی جا سکتی ہے۔

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدؔر

قاضی مشتاق احمد (پونہ)

جب بھی جرمنی کا نام آتا ہے، پتہ نہیں کیوں حیدر قریشی کا نام میرے ذہن میں آتا ہے۔حالانکہ میں آج تک کبھی حیدر قریشی سے نہیں ملالیکن ان کی شاعری کے توسط سے ان سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔حیدر قریشی کی شخصیت میرے لئے ہمیشہ ایک معمّہ رہی۔میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ شخص ایک اچھا شاعر ہے!اچھا افسانہ نگار ہے!اچھا نثر نگار ہے!اچھا ماہیا نگار ہے!اچھا ناقد ہے یا اچھا محقق!

بقول شخصے حیدر قریشی ''مختلف الجہات شخصیت'' ہیں۔

نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گُل، کبھی کتاب لگے

حال ہی میں اپنے دورۂ یورپ میں جرمنی گیا تھا۔مجھے ہائیڈل برگ میں وہاں کی یونیورسٹی بھی دیکھنا تھی۔بلیک فارسٹ میں ''ڈربہ سنٹر'' بھی دیکھنا تھا جہاں کُکُو گھڑیاں ملتی ہیں،جن سے کُکُو (بلبل) نکل کر ''کہُو۔۔کہُو'' کہتی ہے۔مجھے پرفیوم کے لئے مشہور شہر ''کلون'' بھی دیکھنا تھا اور یہ بھی معلومات حاصل کرنا تھی کہ آخر اُس مشہور زمانہ عطّار نے اس مشہور عطر کا نام اپنے نام کی بجائے اپنے شہر کے نام سے کیوں منسوب کیا؟ مجھے ''ویمر'' شہر بھی دیکھنا تھا جہاں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے مدفون ہے۔علامہ اقبال نے اپنی نظم ''مرزا غالب'' میں غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا تیرا شاعری میں ہم پلہ تیرے ہم عصروں میں ہے تو وہ گوئٹے ہے۔لیکن کیا زمانے کا انقلاب ہے کہ تُو جس شہر میں (دہلی میں) مدفون ہے وہ اُجڑ چکا ہے اور گوئٹے جس شہر (ویمر) میں مدفون ہے وہ آباد ہے۔

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

ان تمام قابلِ دید مقامات دکھانے کی ذمہ داری اُس کمپنی نے لی تھی جس کے ساتھ میں یورپ کے ٹور پر گیا

تھا۔ادھر انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری بھی کی۔اس ''ٹائیٹ شیڈول'' میں کسی سے ملاقات کے لئے وقت نکالنا بہت مشکل تھا لیکن میں اپنی اس خواہش پر قابو نہ پا سکا کہ حیدر قریشی سے ملاقات ہو جائے۔میں نے انہیں اپنے پروگرام سے مطلع کیا اور انہوں نے مجھے فوری طور پر ای میل پر جواب دیا کہ اگرچہ وہ اس مقام سے بہت دور رہتے ہیں جہاں میں ٹھہرنے والا ہوں لیکن جونہی وہ نہیں میری آمد کی اطلاع ملے گی وہ مجھ سے ملنے کے لئے ضرور آئیں گے۔مجھے افسوس ہے کہ ڈربہ سینٹر میں ہم بلبلوں کی ''کہُو۔۔۔کہُو'' سنتے رہے اور اس شاعرِ خوش نوا سے ملاقات کا موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

ہر چہرے پہ تھی ثبت شناسائی کی تحریر
میں اجنبی لوگوں کے قبیلے میں کھڑا تھا

پتہ نہیں ایسا کیوں ہو جاتا ہے کہ کسی ایک ملک، کسی ایک شہر کا نام کسی ایک شخص کے نام سے کیوں مشہور ہو جاتا ہے۔غالبؔ کے زمانہ میں دلّی میں سینکڑوں کی تعداد میں ایک سے بڑھ کر ایک شعراء تھے لیکن دلّی کو ''غالبؔ کی سرزمین'' کہا گیا۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی شہر کو جانتے تک نہیں لیکن کسی شاعر کی وجہ سے وہ شہر بھی مشہور ہو جاتا ہے۔جیسے ''گلاوٹھ'' کا مجھے آج تک پتہ نہیں کہ یہ شہر کہاں ہے لیکن جب ناطق گلاوٹھی کا ذکر ہوتا ہے تو ہم ''گلاوٹھ'' کا نام ضرور لیتے ہیں۔اصغر گونڈوی کے نام سے ''گونڈہ'' اور صادق سردھنوی کے نام سے ''سردھنہ'' ۔کچھ ایسا ہی حیدر قریشی کے ساتھ ہوا۔جرمنی میں آج کتنے ہی ایسے فنکار ہیں جو مغرب میں رہ کر اپنی مشرقی تہذیب اور اپنی زبان اردو کو نہیں بھولے،لیکن شہرت حیدر قریشی کو ملی۔

یہ کس حساب سے کی تُو نے روشنی تقسیم
ستارے مجھ کو ملے، ماہتاب اُس کا تھا

(وزیر آغا)

پچھلے دنوں ''انتساب'' کے ایک شمارہ میں پُونہ شہر کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر سیفی سرونجی نے لکھا تھا:''یہ وہ شہر ہے جہاں اردو کے مشہور افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد رہتے ہیں'' اس جملہ پر میرے چند کرمفرماؤں نے اعتراض جتایا۔ممکن ہے کچھ ایسا ہی اس بات پر اعتراض ہو کہ حیدر قریشی کا ذکر اس انداز میں ہوا ہے۔

جسے سمجھتے تھے صحرا وہ اک سمندر تھا
کھلا وہ شخص تو ہم کیسے آب آب ہوئے

اس لئے ضروری ہے کہ ہم حیدر قریشی کی شخصیت کو ان کے فن کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں۔حالانکہ یہ

صرف ایک جھلک ہے۔حیدر قریشی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں معنوی تہہ داری،فنّی پختگی کے علاوہ شوخی وشرارت کا رنگ بھی شامل ہے۔حیدر قریشی کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ہوا شہکار جب اس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پتھر بول اُٹھتے ہیں

عکس کھو جائیں اگر ہلکا سا کنکر بھی گرے
پانیوں میں ایک ایسا آئینہ رکھا گیا

شرطوں پہ محبت کی کوئی بات نہ کرنا
یہ تیرا طلب گار شہنشاہ نہیں ہے

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدرؔ
مجھ پہ جو شاعری اتارتا ہے

دلوں کا خون کرنے لگ گئے ہو
بڑے سفّاک ہوتے جا رہے ہو

مٹنے ہی جو والا ہے ابھی خاک پہ گر کر
پلکوں پہ لرزتا کوئی آنسو ہے کہ تُو ہے

یونہی تنگ بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدرؔ

بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد جب ہم حیدر قریشی کے یہ اشعار پڑھتے ہیں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ حیدر قریشی نے یہ اشعار کیوں اور کس مُوڈ میں لکھے ہیں۔

چاہے وہ بال بچوں والی ہے
دل کی منطق مگر نرالی ہے

چالاکی کہاں آتی ہے حیدرؔ کو مری جان
بس تیری اداؤں کی کرامات سے آئی

جنہیں میں چاہتا تھا شادیاں کرا بیٹھیں
جو پیار کرتی تھیں وہ پیار والیاں بھی گئیں

لیکن اِن سنجیدہ اشعار کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حیدر قریشی کا سنجیدہ لب ولہجہ ان کی اصل پہچان ہے۔

جب یزیدِ عصر کے لشکر سے باہر آ گئے
حُر سے نسبت اپنی بھی تھوڑی سی حیدرؔ ہو گئی

ابھی تو زور ہی ٹوٹا ہے جابروں کا،ابھی
نظامِ جبر کا پورا زوال باقی ہے

کچھ اور بڑھ گیا ہے سلسلہ تذبذب کا
یقین ختم ہوا،احتمال باقی ہے

حیدر قریشی کا ایک کارنامہ ماہیا نگاری کا احیاء بھی ہے۔اردو شاعری کو ایک نئی سمت دینے کا سہرا حیدر قریشی کے سر جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حیدر قریشی نے بھیڑ سے الگ اپنی راہ نکالی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

وہ ایک کشتی پہ اپنی رفاقتوں کا سفر
اور اس کا سر کے دوپٹے کو بادباں کرنا

پھر وقت کے برگد کے تلے، گیان کی دُھن میں

نکلا ہوا گھر سے کوئی سادھو ہے کہ تُو ہے

امید ہے ’’گیان کی دُھن‘‘ میں نکلے ہوئے اس گیانی کو اپنی منزل ضرور ملے گی۔ گیان کی اصل منزل ہے عشق، اور

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدرؔ

مجھ پہ جو شاعری اتارتا ہے

غالب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک غم انگیز بلند فکری سطح سے جب چیزوں پر ایک نظر ڈالتا ہے تو غیر معمولی اشیاء معمولی اور معمولی چیزیں غیر معمولی بن جاتی ہیں۔ تب اس کے ہاں وہ تبسم جاگتا ہے جو "جان لینے" کا ایک انوکھا زاویہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک کم تر سطح پر عدم کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ جو انسانی اعمال، مظاہر، حتیٰ کہ خود پر ہنسنا بھی جانتا تھا۔ ویسے غالب اور عدم میں بُعد القطبین ہے مگر ان کی جہت ایک ہے وہ جہت جو شاعر کو لحظہ بھر کے لئے وقت کے بہاؤ سے الگ کر کے ناظر کی حیثیت تفویض کر دیتی ہے۔ ولیم بٹلر ییٹس نے اپنی مشہور نظم Long Legged Fly میں اس بھنورے کے کردار کو پیش کیا ہے جو پانی کی سطح پر چلتا ہے مگر اس کے ساتھ بہہ نہیں جاتا یعنی وقت کی ندی رواں دواں رہتی ہے مگر رواں ندی کے کسی ایک مقام پر "چلنے" کے عالم میں ٹھہرا ہوتا ہے۔ اس کی دوسری مثال بھگوت گیتا کا کنول ہے جو پانی میں رہتے ہوئے بھی پانی سے تر نہیں ہوتا۔ غالب کی شاعری اس خاص قسم کے معروضی رویے کی بہترین مثال ہے۔ دوسری طرف عدم کے ہاں کمتر سطح پر سہی لیکن یہ رویہ اُبھرا ضرور ہے۔ اُردو کے نئے غزل گو شعراء میں مجھے حیدر قریشی کے ہاں یہی رویہ نظر آیا ہے۔ اگر اس کی غزل میں یہ انداز مزید نکھر سنور سکا تو اس بات کا امکان ہے کہ اس کی غزل دیگر بہت سے غزل گو شعراء سے بالکل الگ نظر آنے لگے گی۔۔۔۔۔ ایک ایسے شخص کا تصور کیجیے جس کا ایک ہاتھ تو اپنے سینے میں سلگتے ہوئے درد پر رکھا ہو اور دوسرے ہاتھ سے وہ زندگی کو معنی خیز اشاروں سے چڑا رہا ہو تو آپ کو حیدر قریشی کے اس رویے کا کچھ اندازہ ہوگا جو اس کے بعض غزلیہ اشعار میں ابھرا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ اگر پھولتا پھلتا گیا تو اسے غزل گو شعراء کے جم غفیر سے بالکل الگ کر دے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ **ڈاکٹر وزیر آغا**

(حیدر قریشی کے اوّلین شعری مجموعہ ’’سلگتے خواب‘‘ کے پیش لفظ سے اقتباس)

حیدر قریشی کی غزل گوئی

ڈاکٹر فراز حامدی (جے پُور)

حیدر قریشی کو آج ماہیا نگاری کے احیاء و فروغ کے وسیلے سے پوری اردو دنیا جانتی ہے مگر وہ مختلف الجہات شخصیت کے حامل ہیں اور اُن کے ادبی قد و قامت کا اندازہ کئی زاویوں سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک بہترین شاعر ہیں تو لائق ترین نثر نگار بھی کہے جاسکتے ہیں۔ اگر انہوں نے غزلیں، نظمیں، ماہیے لکھ کر شعر و سخن کے دفینے کو وسیع و دقیع بنایا ہے تو افسانے، خاکے، انشائیے لکھ کر نثری ادب کے خزانے میں بھی بھر پور اضافہ کیا ہے۔ تحقیق کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بخوبی اُجاگر کیا ہے تو تنقید کی شاہراہ پر بھی اپنی سوجھ بوجھ سے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کھٹی میٹھی یادوں کو حرزِ جاں بنا کر یادنگاری پر خانہ فرسائی کی ہے تو سرزمینِ حجاز کے مقدس سفر کو بھی ادیبانہ شان سے لکھ ڈالا ہے۔ بلاشبہ حیدر قریشی ایک شدت پہلو شخصیت رکھتے ہیں جو دلکش بھی ہے اور دلنواز بھی اور حد درجہ قد آور بھی ہے اور باوقار بھی۔

ویسے تو حیدر قریشی کی شاعری "سلگتے خواب" سے لے کر "دعائے دل" تک پچیس ۲۵ سالوں پر محیط ہے اور یہ شاعری غزلوں، نظموں اور ماہیوں کا مثلث تو کہی جاسکتی ہے مگر لاریب غزل اس کا انحصار ہے۔ غزل جو اردو شاعری کی کلاسیکی صنف اور مشرق کی پیداوار ہے۔ غزل جو ہماری ثقافتی قدروں کی امین اور تہذیبی رویوں کی پاسدار ہے، غزل جو ہماری شعری روایت کی آبرو ہے اور جو تمام اردو اصنافِ سخن میں مقدم و محترم ہے جب کوئی شاعر تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اور شاعری کی شروعات کرتا ہے تو سب سے پہلے غزل کو ہی اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ حیدر قریشی بھی اوّلاً غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے اور ابھی بھی دوشیزۂ اردو غزل کے گیسو سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔

حیدر قریشی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزلیں اس وجہ سے بھی اہمیت کی حامل ہیں کہ وہ مغرب میں بیٹھے ہوئے خالص مشرقی صنفِ سخن پر مشقِ سخن کر رہے ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر دلدادگانِ سخن سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اگر اُن کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کی غزلیہ شاعری کے بھی چار ادوار مقرر

کیے جاسکتے ہیں۔

حیدرقریشی کا اولین مجموعہ کلام "سلگتے خواب" صرف غزلوں پر مشتمل ہے ان غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے روایت کی پاسداری کی ہے اور قدیم رنگِ سخن میں اشعار کہے ہیں۔ ان غزلوں میں شعری ریاضت تو نہیں مگر اُسلوبی صداقت اور جذباتی تمکنت ضرور ملتی ہے۔ وہ رموزِ شاعری سے واقف ہیں اس لیے جو کچھ کہا ہے ان میں سلیقہ جھلکتا ہے۔ فرسودہ مضامین اور روایتی موضوعات میں بھی انہوں نے انفرادیت ثابت کی ہے۔ قارئین ان کی سادہ بیانی سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے تخلیقی شعور کی داد دیتے ہیں۔ اس نوع کے اشعار بھی عمومیت اور سطحیت سے پاک ہیں۔ مثلاً

نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں نہ پڑھ پاؤں   کبھی وہ چاند، کبھی گل، کبھی کتاب لگے

دیکھا خلوص موت کا تو یاد آ گیا   کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں   سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

تمہیں نے تھوڑا سا خود کو جھکا لیا ہوتا   چلو ہماری اگر کج کلاہیاں نہ گئیں

اداس لمحوں کے ہونٹوں میں تازگی بھر دو   بجھے ہوئے مرے چہرے میں روشنی بھر دو

دلوں کا خون کرنے لگ گئے ہو   بڑے سفاک ہوتے جا رہے ہو

شاداب و شگفتہ لہجے میں بیان کی تازہ کاری صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ غزل کی اس وادئ پرخار میں جوں جوں حیدرقریشی آگے بڑھتے ہیں توں توں ان میں غزلیں مارنے کی جستجو پیدا ہوگئی ہے۔ فکری توانائی اشعار میں انگڑائیاں لینے لگی ہے اور ان کے جمالیاتی شعور کو نکھارتی ہے۔

وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے   ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

زباں ایسی کہ ہر اک لفظ مرہم سا لگے اُس کا۔۔۔۔۔   نظر ایسی کہ اُٹھتے ہی دلوں میں تیر ہو جائے

جسے سمجھتے تھے صحرا وہ اک سمندر تھا   کھلا وہ شخص تو ہم کیسے آپ آپ ہوئے

وہ بھید، وہ اسرار کھلے مجھ پہ بدن کے   دنیا میں ابھی تک جو کسی نے نہیں دیکھے

ہوا شہکار جب اس کا مکمل   وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

یادوں کے جزیرے میں آیا تھا جو چپکے سے   اشکوں کے سمندر میں وہ ڈوب گیا چہرہ

اس دور کی غزلوں میں جذباتی ردِعمل کے پھیلاؤ کی صورت ملتی ہے جو جمالیاتی احساس سے مربوط ہو کر شعریت میں جذب و کشش پیدا کرتی ہے۔ چیدہ چیدہ اشعار لذت و لطافت کا احساس کراتے ہیں۔

عکس کھو جائیں اگر ہلکا سا کنکر بھی گرے   پانیوں میں ایک ایسا آئینہ رکھا گیا

ہم ایسے سخت جان تھے جو ٹوٹتے نہ تھے   کچھ ٹوٹ بھی گئے تو بکھر نا نہ آ سکا

لفظ اندھے ہو گئے، سوچوں کو پتھر کر گیا   ایک ہریالی کا پیکر دل کو بنجر کر گیا

ہر چہرے پہ تھی ثبت شناسائی کی تحریر   میں اجنبی لوگوں کے قبیلے میں کھڑا تھا

بجھا گئیں جو کئی آفتاب چہروں کو   ان آندھیوں کے بدن بھی جلائے جائیں گے

عجیب نشہ، عجیب سا سرور خاک میں ہے   کہ خاکساری کا سارا غرور خاک میں ہے

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی   کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

حیدرقریشی کے دوسرے دور کو میں ہنگامی دور کہوں گا کیونکہ جدیدیت کی فکری یلغار ان پر اثر انداز ہوئی تو وہ رسمی اور روایتی شاعری کے حصار سے تو باہر نکل گئے مگر جدیدیت کی مجہول دلدل میں پھنس گئے۔ شعری اظہار کی حد بندی کے باوجود آزادانہ کارگزاری کا عمل شروع ہوا۔ جدیدیت کے غالب رجحان نے انہیں اس قدر مغلوب کر دیا کہ وہ بھی دیگر جدیدیت کے حامی انتہا پسند شعراء کی طرح اپنی شاعری کو گنجلک کر بیٹھے۔ جدیدیت کی شدت پسندانہ کوشش نے مہمل گوئی اور معمّہ بازی کو رواج دیا۔ فکری سطح پر اور تخلیقی رویّوں میں بے راہ روی پیدا ہوگئی مگر غزل کی دلکشی حدیث دلبراں اور مشاہدۂ حق کی گفتگو سے قائم ہے۔ جب غزل میں "حکایت با یار گفتن" نہ ہو تو اس میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔ اس دور میں حیدر صاحب کی غزلوں کا لب و لہجہ بدل گیا ہے اور معنویت و داخلیت میں تبدیلی بھی صریح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

جب آئے موسموں کی زد میں ساونوں کے بدن   ہوا میں بھیگ گئے ننگی بارشوں کے بدن

سنائی دیتا ہے بہری سماعتوں کو شور   انہیں بلاتے ہیں اندھی بصارتوں کے بدن

اک ایک لفظ ہو گیا ہو بانجھ جس طرح   سوکھے ہیں یوں معانی کتابوں کی جھیل میں

جیسے خاموشی چٹخنے کی صدا آئی ہو   یوں گرا ٹوٹ کے ان زرد خزاؤں کا فریب

کون دیکھے گا بھلا ان جلتی آنکھوں کے عذاب   جھیلتے رہنا ہے جن کو اندھے خوابوں کے عذاب

کہاں تو اوّل اوّل حیدر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ:

اِک فرشتہ ہے عشق کا حیدؔر   مجھ پہ یہ جو شاعری اُتارتا ہے

اور جدیدیت کی چکا چوند انہیں "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کے اسٹیج پر لے آئی مگر غنیمت ہے کہ وہ جلد ہی اندھی بصارتوں اور بہری سماعتوں کے مکڑ جال سے باہر نکل آئے اور بدستور درد دل کے راستے پر گامزن ہوگئے۔ جب

شعور میں بالیدگی آجاتی ہے اور سوچیں ایک مرکز پر قائم ہو جاتی ہیں تو انسان بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاتا ہے۔
تیسرے دور کی شاعری میں حیدر صاحب Non-Commitment والی شاعری سے بصیرت و بصارت پا کر اٹوٹ جذبے کے ساتھ آگے بڑھے ہیں اور اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ ان کے فن پاروں میں بھی سچائی ہو، دلکشی ہو، تاثیر ہو، کشش ہو اور تخلیقی عمل کی ساری کارگزاری براہ راست قاری تک پہنچ سکے۔ ان کی کوششیں بارآور ہوئی ہیں۔ "عمرِ گریزاں" سے "دعائے دل" تک حیدر قریشی نے ایک پُل صراط عبور کیا ہے اور اس درمیان کئی منظرنامے ان کی نظر سے گزرے ہیں۔
دورِ چہارم میں حیدر قریشی اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں مثبت پہلوؤں کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں تا کہ فکر و فن کو اور جلا دی جا سکے، انجان راستوں سے ان کی مراجعت شعری تاثر ساتھ لے آئی ہے۔ اب ان کی غزلوں میں ایک فکر آگیں رویّہ کا احساس ہوتا ہے۔ اکثر غزلوں میں شخصی تجربات اور عصری میلانات حقیقت کا اشاریہ بن کر سامنے آتے ہیں اور پوری شعری تہذیب جھلک اُٹھتی ہے۔ چند اشعار مثالوں میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

کبھی دریا کی لہروں پر، کبھی صحرا کے سینے میں — محبت کا نیا قصہ سدا تشکیل ہونا ہے
شرطوں پہ محبت کی کوئی بات نہ کرنا — یہ تیرا طلب گار شہنشاہ نہیں ہے
آسماں کی کوئی نہیں پرواہ — میرے پیروں تلے زمین رہے
آنکھ میں، دل میں، لہو میں رقص فرمانے لگا — کس ادا کے ساتھ وہ مجھ سے جدا ہوتا گیا
اس کے ہونٹوں کی محراب، دعاؤں والی — اس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے
وہ مسکرا تو دیا ہوگا سوچ کر مجھ کو — پر اُس کی آنکھ سے آنسو بھی بہہ گئے ہوں گے

ان اشعار سے حیدر قریشی کا فکری رجحان اور ذہنی میلان معلوم ہو جاتا ہے مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کہیں کہیں اشعار میں شوخی اور چلبلا پن بھی ملتا ہے۔ کہیں طنز کی کاٹ سے وہ دل میں نشتر چبھوتے ہیں تو کہیں معصومانہ شرارت شعر میں ڈھل جاتی ہے۔

جنہیں میں چاہتا تھا شادیاں کرا بیٹھیں — جو پیار کرتی تھیں پیار والیاں بھی گئیں
بچی ہوئیں تھیں جو دو چار خواہشیں حیدرؔ — لو آج دل سے ہمارے وہ سالیاں بھی گئیں
چالاکی کہاں آتی تھی حیدرؔ کو مری جاں — بس تیری اداؤں کی کرامات سے آئی
غموں سے اس کو ہمیشہ نہال رکھتا ہے — ہمارے دل کا وہ کتنا خیال رکھتا ہے
مشک جیسی کوئی بھی شے کب چھپانے سے چھپی — آپ کو پھر کس لیے صاحب چھپانی پڑ گئی

بڑھ کر ترے نشانے کی زد پہ خود آؤں گا — پہلے نظر کو تیر، بدن کو کمان کر
سدا دولتِ حسن رہتی نہیں — اسے میرے تک آنی جانی کرو
چاہے وہ بال بچوں والی ہے — دل کی منطق مگر نرالی ہے
تختِ شہی تھے جس کی نظر میں حقیر سے — اس کے تعلقات ہیں اب ہر امیر سے
تمہارا حسنِ خداداد تو نہ رہ پایا — مگر فقیر کا حسنِ خیال باقی ہے

لہجہ کی تازگی اور بیان کی شگفتگی ان کے اشعار کی اہم خصوصیت ہے۔ ان کی شاعری کی مدت کو کم و بیش بیس ۲۰ پچیس ۲۵ سال ہو گئے ہیں اور اب ان میں شعر کہنے کا نہ صرف سلیقہ آیا ہے بلکہ فنی پختگی، فکری سنجیدگی، مواد و ہئیت کی ہم آہنگی اور معنوی تہہ داری کی خصوصیات بھی ان کی غزلوں میں در آئی ہیں۔ بعض اشعار میں حیدر قریشی ایسی دھیمی آگ بھر دیتے ہیں کہ دل کو پگھلا دیتی ہیں اور ذہن کو جھلسا دیتی ہے۔

ابھی تو زور ہی ٹوٹا ہے جابروں کا ابھی — نظامِ جبر کا پورا زوال باقی ہے
کچھ اور بڑھ گیا ہے سلسلہ تذبذب کا — یقین ختم ہوا، احتمال باقی ہے
جبر کے کرب و بلا کی خاک میں رلتی ہوئی — زندگی بھی حضرتِ زینبؑ کی چادر ہو گئی
جب یزیدِ عصر کے لشکر سے باہر آ گئے — حُرؔ سے نسبت اپنی بھی تھوڑی سی حیدرؔ ہو گئی
وہ ایک کشتی پہ اپنی رفاقتوں کا سفر — اور اس کا سر کے دوپٹے کو بادباں کرنا
چٹان تھا وہ سو اس میں شرر بھی رہتا تھا — شدید ضرب کا مجھ میں ہنر بھی رہتا تھا
مٹنے ہی جو والا ہے ابھی خاک پہ گر کر — پلکوں پہ لرزتا کوئی آنسو ہے کہ تو ہے
پھر وقت کے برگد کے تلے گیان کی دھن میں — نکلا ہوا گھر سے کوئی سادھو ہے کہ تو ہے

آج شعراء کی بھیڑ میں اپنی شناخت قائم کرنا بہت مشکل ہے مگر حیدر قریشی نے اپنے لب ولہجہ اور فکری تازگی سے ہر سنجیدہ قاری کو متاثر کیا ہے اردو کی نئی بستیوں میں ان کی غزلیہ شاعری نے قابلِ قدر اثرات مرتب کئے ہیں۔ حیدر قریشی نے اگر ایسا کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا۔

یونہی تک بندی نہیں کی ہے غزل میں حیدرؔ — بھیڑ سے اپنی الگ راہ نکالی ہم نے

حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ ایک بار پڑھنا شروع کیا تو جی چاہا پڑھتی ہی رہوں۔
روانی کے ساتھ دوسرا اہم وصف بے باکی اور وارفتگی کا ہے جو حیدر قریشی کی شاعری میں نمایاں ہے۔
شعری مجموعہ "عمرِ گریزاں" کے فلیپ پر درج **ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹرہیلڈ** کے تاثرات

حیدرقریشی کی

’’غزلیں،نظمیں،ماہیے‘‘

ڈاکٹر نجمہ رحمانی (دہلی)

اِسے اردوزبان کی بدقسمتی کہیئے یا خوش قسمتی سمجھئے کہ جس دھرتی سے اس کی کونپل پھوٹی وہاں اس کی جڑیں آہستہ آہستہ سوکھتی جارہی ہیں لیکن مہاجر پرندوں نے اجنبی زمینوں پراس کی تخم ریزی کی اوراسے تناور درخت میں تبدیل کیا ہے۔آج اردودنیا کی ایک بڑی آبادی کی مقبول ترین زبان ہے۔ہمارے بہترین ادیب و شاعرکینیڈا،نیویارک،ڈنمارک اور جرمنی کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی آباد ہیں اوراردو کی ترویج وترقی میں ایک فعال کردارادا کررہے ہیں۔ان کی شاعری اور کہانیاں اپنی دھرتی کے ساتھ اُن اجنبی فضاؤں کی خوشبو سے بھی رچی بسی ہیں جنہیں ان فنکاروں نے اپناوطن بنایاہے۔اس فہرست میں حیدرقریشی ایک نمایاں نام ہیں۔
حیدرقریشی سے میرا غائبانہ تعارف صرف شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ افسانہ نگاراور انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی ہے۔اس کے علاوہ تنقید کے میدان میں بھی انہوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔یوں وہ اردو دنیا کے فعال قلم کاروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔جرمنی جیسے ملک میں جہاں اردو بولنا تو درکنار اردو سمجھنے والوں کی تعداد بھی انگلیوں پرشمار کی جاسکتی ہو،چار شعری مجموعوں اور گیارہ نثری کتابوں کا مصنف ہونا بڑے جگرے کی بات ہے مگرانہوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیاہے۔
شاعر کی حیثیت سے حیدرقریشی مقام کے مالک ہیں۔رنگوں کی ایک دھنک ہے جوصفحات پر بکھرتی چلی جاتی ہے۔اب یہ قاری کے ذوقِ طبع پر منحصر ہے کہ وہ تسکینِ دل کے لئے کس رنگ کا انتخاب کرے۔مگرایک چیز جوان

کے یہاں صاف طور پرمحسوس کی جاسکتی ہے وہ ان کانکھرا ہوا شفاف انداز ہے جس میں نہ ابہام کی دھند ہے،نہ قنوطیت کے اجاڑ منظر،نہ الفاظ کی وہ تیز کٹار جوذوقِ سلیم کو مجروح کرجائے۔وہ جذبات کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کوسلگتی ہوئی آنچ میں تبدیل کرنے کا فن جانتے ہیں۔وہ قاری کواپنی طرف گھسیٹنے کے بجائے آہستہ روی سے اس کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔اسی لئے ان کی شاعری میں ایک مانوس فضا سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔
حیدرقریشی کا تعلق پاکستان سے ہے اور قیام جیسا کہ اوپر عرض کیا جرمنی میں۔لیکن دور دراز ملک کے باسی ہونے کے باوجودان کی شاعری میں اپنے ملک سے جڑاؤ کا احساس جابجا ملتا ہے۔وہ غیر ملک کی برکتوں کے منکر نہیں لیکن بے گھری کے کرب کو وہی سمجھ سکتا ہے جو گھر کی دہلیز پار کر چکا ہو اور پیچھے مڑکر دیکھنے میں پتھر بن جانے کا خطرہ ہو۔اسی لئے ان کی غزلوں میں گھر،راستہ،فاصلہ،جیسے الفاظ کا استعمال مختلف انداز میں ہوا ہے۔

دشتِ حیرت میں کھڑا ہوں چشمِ حیرت وا کئے
ہیں ابھی غائب،ابھی موجود گھر کے راستے

ہم ازلی آوارہ جن کا گھر ہی نہیں ہے کوئی
لیکن جن رستوں سے گزریں،رستے گھر ہوجائیں

اَنجانے راستے سبھی جانے ہوئے لگے
لگتی تھی اجنبی مِری آوارگی مجھے

جرمن احسانات سبھی برحق حیدؔر
فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے

بے خانماں یہ شخص کہ حیدؔر ہے جس کا نام
اے ارضِ پاک دیکھ لے تیرا ہی لال ہے

اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں احساسِ تنہائی انہیں رہ رہ کر اس طرح تڑپاتا ہے کہ اس کی حدیں ناامیدی سے جاملتی ہیں۔مگر زندگی کے تقاضے کہتے ہیں کہ دنیا کے بازار میں جہاں شے کی بولی لگتی ہے وہاں نیلام ہونا تمہارا مقدر ہے۔

فاصلوں کا اس طرح نازل ہوا ہم پر عذاب
مل بھی جائیں گے تو کوئی فاصلہ سا رہ جائے گا

لُٹ گیا آج مرے دیس کے سورج کا شباب
کھا گیا دھوپ کو اِن کالی گھٹاؤں کا فریب

مشینوں کے اس عہدِ ناروا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا

ہر چہرے پہ تھی ثبت شناسائی کی تحریر
میں اجنبی لوگوں کے قبیلے میں گھِرا تھا

حیدر قریشی کی غزلوں میں عاشقانہ روایت کی پاسداری بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔ رنگ، خوشبو، صبا، چاند، تارے، کرن، پھول شبنم، شفق، آبجو، چاندنی، کونسی تشبیہ ہے جو محبوب کے سراپے کے لئے استعمال نہ کی گئی ہو، ہجر و وصال کی داستانیں، جذبات کی رنگین بیانیاں، پرداداریٔ عشق کی پردہ دری، وہ تجاہلِ عارفانہ، وہ نگاہِ مستانہ، کیا نہیں جو ان اشعار میں سمٹ نہ آیا ہو۔

نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گُل، کبھی کتاب لگے

وہ جو خوشبوؤں کا خرام ہے، جو دھنک کا عکسِ جمیل ہے
مِرے اس کے بیچ کوئی عجیب سے فاصلوں کی فصیل ہے

وہ چاند، وہ گلاب، وہ پتھر، وہ آگ بھی
جیسی مثال دیجئے برحق مثال ہے

خود اپنے حُسن کے نشّے میں چُور لگتا ہے
جو سر سے پاؤں تلک رنگ و نُور لگتا ہے

ہاتھ آتی نہیں دھنک جیسے
وہ بھی رنگوں کا ایک جادو ہے
جب تلک دیکھوں اک گلاب ہے وہ
اور چھُونے لگوں تو خوشبو ہے

ان کے عشقیہ کلام میں تازہ گلابوں کی مہک کے ساتھ ایک زرد اداسی کا احساس بھی ہے۔ ہجر کی دوپہر کی تپش، ایک بے نام سناٹا گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور سناٹوں کی صدائیں دل کی خالی دیواروں سے ٹکرا کر ایسا پُر سُرور درد پیدا کرتی ہیں جو نا قابلِ بیان ہے۔ اس نا قابلِ بیان درد کا بیان حیدر قریشی کی غزلوں میں جا بجا بکھرا نظر آتا ہے۔

یوں تو پہلے بھی وہ کرتا تھا اداس آ کر مگر
اب کے دل کی اور ہی حالت ستمگر کر گیا
چند لمحوں کے لئے ٹھہرا گھٹاؤں کی طرح
خالی آنکھوں کو مگر رنگوں کا منظر کر گیا

نظر سے دور ہے لیکن نظر میں ہے پھر بھی
کہ عکس اپنے مرے آئینوں میں چھوڑ گیا

مُرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں روح کی گہرائی سے

غزل کی کلاسیکی روایت میں محبوب کے تصور کے ساتھ سنگدل، ہرجائی حسین صورت اُبھر آتی ہے اور عاشق بیچارا

،خستہ حال، چاک گریباں، یاس وحرماں کا مارا اور محبوب کے ہر ستم پر ''ہاں'' کہتا ہوا نظر آتا ہے۔ہاں غالبؔ ان معنوں میں قدرے مختلف ہیں کہ اکثر اپنی کجکلاہی کے ساتھ محبوب سے باقاعدہ جھگڑا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔نئی غزل میں البتہ جہاں تصورِ عشق بدلا، وہیں تصورِ عاشق و معشوق میں بھی انقلابی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔معاملاتِ عشق میں دو رجحانات کھل کر سامنے آئے۔اب عشق میں متانت کے ساتھ کاروبارِ جہاں کا احساس بھی ہے اور عاشق و معشوق کا تعلق برابری کا ہے۔اب معاملہ یہ ہے کہ بقول کشور ناہید

عشق نے سیکھ لی ہے کام کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

وہ فنافی المحبوب والے زمانے ہوا ہوئے اور بات یہاں تک آ پہنچی کہ تُو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔دوسری طرف افلاطونی عشق پر بدن کی خواہشیں غالب آنے لگیں۔اس پورے ڈرامے سے قاصد اور رقیب کے کردار غائب ہوئے اور معاملات آمنے سامنے طے پانے لگے۔بس ایک ہلکی سی جھجک ضرور باقی رہی، وہ بھی ایسی نہیں کہ قابلِ ذکر ہو۔جہاں معاملات برابری کے ہیں وہاں 'انا' کا مسئلہ بھی آ کھڑا ہوتا ہے۔حیدرؔ کے اشعار میں سارے رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

کسی بھی لفظ کا جادو اثر نہیں کرتا
وہ اپنے دل کی مجھے بھی خبر نہیں کرتا

اپنی ہوا میں کب تلک اُڑتا پھرے گا تُو
میرے چراغِ جسم کی جانب بھی دھیان کر

یہ اور بات کہ اقرار کر نہیں پاتا
مگر وہ دل تو محبت شناس رکھتا ہے

ٹھہرنے بھی نہیں دیتا ہے اپنے دل میں مجھے
محبتیں بھی مری دل بدر نہیں کرتا

یہ خواب بھی تیرے تھے انہیں ساتھ ہی لے جا
یہ بجھتے ہوئے خواب مرے خواب نہیں تھے

بنا ہوا ہے بظاہر وہ بے تعلق بھی
جو مجھ کو سوچے بنا دن بسر نہیں کرتا

تمہارے قرب نے ٹھنڈک کا اک احساس تو بخشا
مگر اس جسم کی جلتی، مچلتی پیاس باقی ہے

آتے آتے عقل بھی آخر ہمیں آنے لگی
ذہن و دل سے حُسن کا جادو دھواں ہونے کو ہے
خود کو کیا سمجھاؤں اور لوگوں سے کیا بحثیں کروں
خود دلِ خوش فہم تجھ سے بدگماں ہونے کو ہے

لیکن حیدر قریشی کی دنیا صرف عشق و محبت کے رنگین افسانوں سے مزّین نہیں بلکہ ان کی شاعری میں عصرِ حاضر کا وہ کرب بھی شامل ہے جس سے اس عہد کا ہر ذی شعور اور حساس انسان دوچار ہے۔قصرِ سیاست کی عیاریوں کے ساتھ عام انسان کی بدلتی نفسیات، مادّیت پرستی کے بڑھتے رجحان پر ان کا قلم لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے۔خیالات کا بہاؤ انہیں نیرنگئ دوراں کے نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔کہیں اہلِ اقتدار کی جبریت اہلِ دل کو عذابوں میں مبتلا کرتی ہے، کہیں شعلہ بیانی کا قرض چکانا پڑتا ہے اور کہیں دن کے اندھیرے آسیب بن کر ڈراتے ہیں۔

پھر اہلِ جَور کے حق میں فقیہِ شہر کے صدقے
حدیثِ جبر کی کوئی نئی تاویل ہونا ہے

اندھیرے دن کی مسافت کا سوچ لو پہلے
اجاڑ لمحوں کے آسیب بھی ڈرائیں گے

آ گ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی
کس قدر مہنگی اسے شعلہ بیانی پڑ گئی

عصرِ حاضر کا انسان ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ یہ کشمکش اور گھٹن اس کا مقدر ہے اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا اس کی مجبوری۔ لیکن فنکار مجبوریوں کے اس جال میں ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے اور اس سے نکلنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتا ہے۔ جب اس کی کوششیں اور دعائیں بارآور نہیں ہوتیں تب بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ حقیقت نہ سہی، خوش فہمیوں کا فریب ہی سہی، کچھ تو ایسا ہو کہ یقین اور بے یقینی کے درمیان جھولتی زندگی کے سناٹوں میں کوئی آواز گونجے۔

یہ تو ہوگا کہ میں بھڑکوں گا یا بجھ جاؤں گا
یوں سلگنے سے تو بہتر ہے ہوا ہی مانگوں

شک ہو رہا ہے مجھ کو میں مر تو نہیں گیا
دل کو کوئی خوشی ہے، نہ کوئی ملال ہے

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے

خواہشوں کی تتلیوں کے ساتھ اڑتا ہوں مگر
وسوسوں کے سامنے بے دست و پا رہتا ہوں میں

یہ بے یقینی کا گہرا سکوت تو ٹوٹے
فریب دے کوئی خوش فہمیوں میں ڈال مجھے

یہ صرف عصرِ حاضر کا المیہ ہی نہیں بلکہ ہر عہد کا انسان اس سے دوچار ہوا ہے۔ ہر عہد میں حق و باطل کے درمیان کشاکش رہی ہے اور ہر عہد میں فتح مادّی باطل ہی کو نصیب ہوئی ہے مگر تاریخِ عالَم شاہد ہے کہ پھر وہی فتح گالی بن کر تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہ گئی اور اہلِ حق نے دنیا کے دلوں پر فتح پا کر کامرانی کے علَم بلند کئے۔ اس سلسلے کی

ایک اہم کڑی تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ معرکۂ کربلا رہا ہے، جس کی معنویت سے انکار نہ تب ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔ راہِ حق میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت نے یہ ثابت کر دیا کہ حق بے سروسامان اور بے یارومددگار ہو کر بھی باطل کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ کربلا اردو شاعری خصوصاً جدید غزل کا سب سے موثر استعارہ ہے جس کا ستعمال سیاست کی ریشہ دوانیوں کے لئے ہی نہیں، باطن کی بے صدا آوازوں کے لئے بھی کیا جاتا رہا ہے۔ حیدر قریشی کے کلام میں مجموعی طور پر اس استعارے کا استعمال نسبتاً کم ہے لیکن اس تعلق سے انہوں نے جو اشعار کہے ہیں وہ زورِ بیاں اور اثر آفرینی کے لحاظ سے کافی جاندار ہیں۔

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں

کربلا کی رعایت سے کرب و بلا کے استعمال نے شعر کے حُسن کو نہ صرف چار چاند لگا دیئے ہیں بلکہ واقعۂ کربلا کے مصائب کی پوری تصویر سامنے آ گئی ہے اور اس تعلق سے لبوں کی پیاس اور آنکھوں کے فرات نے شاعر کی دلی کیفیات کی بھرپور ترسیل کر دی ہے۔ کربلا سے متعلق چند اور اشعار پیش خدمت ہیں۔

یہ بجا کہ تم پہ ہوئے ستم، پر اے میرے حیدرِ بے علَم
نہ کوئی تمہارا گواہ تھا، نہ کوئی تمہارا وکیل ہے

جبر کے کرب و بلا کی خاک میں رُلتی ہوئی
زندگی بھی حضرتِ زینبؓ کی چادر ہو گئی
جب یزیدِ عصر کے لشکر سے باہر آ گئے
حُر سے نسبت اپنی بھی تھوڑی سی حیدر ہو گئی

اب آپ کربلا کوئی بے شک سجایئے
دھوکہ ہم اور کر نہیں سکتے ضمیر سے

لیکن جب وہ باطن سے ظاہر کی جانب سفر کرتے ہیں تو ایک بالکل مختلف انسان نظر آتے ہیں۔ یہاں وہ زمانے کی ناسازگاری پر نوحہ کناں ہونے کے بجائے اس کی برکتوں کے ساتھ اس کے عیوب کو بھی قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ زمانہ انہیں جو سکھاتا ہے اسے سیکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں ساید اس تہذیب اور ماحول کا بڑا دخل ہے جس

میں حیدر صاحب زندگی گزار رہے ہیں اور جہاں محبت ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک کاروبار ہے اور کاروبار میں معاملات دل سے نہیں بلکہ دماغ سے طے پاتے ہیں یا ضرورتوں کے تحت سود و زیاں کو نظر میں رکھ کر کئے جاتے ہیں۔ان کا عشق معصوم نہیں چالاک ہے۔دونوں ایک دوسرے کی کیفیات کو جانتے ہیں اور دونوں عیاری کے ساتھ ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے جا رہے ہیں۔

نہیں،اس جیسی عیّاری تو ممکن ہی نہیں تھی
زمانے سے ذرا بس استفادہ کر لیا ہے

ہم بھی چالاک تھے اور تم بھی جہاں دیدہ تھیں
نیّتیں دونوں کی کب دونوں سے پوشیدہ تھیں

یہ کاروبارِ محبت تو فائدہ دے گا
اُسے رسد سے غرض اور مجھے طلب سے ہے

غزل کی بہ نسبت نظم کا فن نسبتاً تفصیل چاہتا ہے مگر اس میں نزاکت یہ ہے کہ تفصیل میں ذرا سی بے احتیاطی شاعری کے اثر کو کم کر دیتی ہے۔تسلسلِ خیال کے ساتھ الفاظ کی دروبست نیز غنائیت پر اگر شاعر کی گرفت کمزور پڑ گئی تو نظم صرف بے جان الفاظ کا مجموعہ رہ جاتی ہے۔حیدر قریشی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے چند کامیاب نظمیں بھی کہی ہیں۔حالانکہ غزل کے مقابلے میں نظم کے موضوعات خاصے مختلف ہیں اور دل پر دماغ کی مضبوط گرفت ہے۔اسی لئے بعض نظمیں ایک خاص سیاسی پہلو بھی لئے ہوئے ہیں۔ان کی طبیعت جس طرح غزل میں کھلتی ہے اس طرح نظم میں کھلتی نظر نہیں آتی۔نظموں کے موضوعات میں جوانی کی امنگیں،تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ اور کائنات کی تخلیق تک خارج و باطن کے دونوں موضوعات شامل ہیں۔خاص طور پر ''منی پلانٹ''،''عجیب دشمن''،''ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام''،''قیامت'' قابلِ ذکر ہیں۔طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پیش کی جا رہی ہے۔

''جابر قیامت جاگ اُٹھی ہے
ہلاکت خیز قوّت اور عظمت کے نشے میں جھومتی
قاہر قیامت ساحلِ مغرب سے نکلی ہے

سمیری سرزمیں کو اب کے اس نے
صرف خشکی اور پانی ہی نہیں
ساری فضا سے،ہر طرف سے،ہر جگہ سے
گھیر رکھا ہے!''(نظم:قیامت)

بنیادی طور پر حیدر قریشی صاحب کا تعلق چولستان کی سرزمین سے ہے لیکن ان کے ماہیوں میں پنجاب کی زمین کی خوشبو اور ہواؤں کی مہک طبیعت کو معطّر کر جاتی ہے۔پنجاب کی سوہنی دھرتی کے شب و روز ان کے ماہیوں کی جان ہیں۔دیس کی فضاؤں کا سارا حُسن تین مصرعوں کی اس صنف میں سمٹ آیا ہے۔جس میں گاؤں کی گلیوں کے کچے پکے رستے ہیں،بچپن کے ہمجولیوں کی اٹھکیلیاں ہیں،اور معصوم شرارتیں بھی،حالانکہ ماہیوں کے موضوعات ہمہ جہت ہیں لیکن گاؤں کی فضا سے مزیّن ماہیوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔

اک خواب ہے جنڈڑی کا
رس بھری لڑکی ہے
یا آم ہے سندھڑی کا

پنجاب کے گیتوں میں بکھرا الہڑ پن،چنچل جوانی کی مستیاں،ان ماہیوں کی خوبصورتی کو دو چند کرتی ہیں۔گاؤں کے رسم رواج،رہن سہن کی خوبصورت تصویر کشی،ان ماہیوں میں کی گئی ہے:

کلیوں کی چٹک بھی تھی
سانولی لڑکی میں
اُپلوں کی مہک بھی تھی

منظر ترے گاؤں کے
گرم دوپہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں

گوری کی سگائی پر

اپنے کلام کے تعارف میں حیدر قریشی نے خود لکھا ہے کہ ایک زمانے میں انہوں نے جدیدیت سے متاثر ہو کر اشعار کہے لیکن بہت جلد اس اثر سے نکل گئے۔لیکن میرا خیال ہے کہ جدیدیت کے ساتھ انہوں نے اینٹی غزل کے تجربات بھی کئے۔اس قسم کے تجربات غزل کے مزاج سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے بہت پہلے ہی اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ میرے نزدیک شاعری کی شرائط میں سے ایک شرط غنائیت بھی ہے۔اینٹی غزل کا پہلا وار غزل کی غنائیت پر ہی ہوا ہے۔حیدر صاحب نے بھی جہاں جہاں ایسے تجربے کئے ہیں، شعریت مجروح ہوئی ہے اور اس قسم کے اشعار سامنے آئے ہیں:

بچی ہوئی تھیں جو دو چار خواہشیں حیدرؔ
لو آج دل سے ہمارے وہ سالیاں بھی گئیں

ہونے لگا ہے پیار اُسی جلد باز سے
جوتوں سمیت جو مرے دل میں اُتر گیا

چاہے وہ بال بچوں والی ہے
دل کی منطق مگر نرالی ہے

اب چلتے چلتے تھوڑی سی بات شاعری کی زبان پر بھی کہ شاعری صرف جذبات کے سہارے بہت دور تک نہیں چل سکتی۔حیدر صاحب الفاظ کے استعمال کا فن جانتے ہیں، اس لئے ان کے کلام سے بہت سے خوبصورت اشعار انتخاب کئے جا سکتے ہیں۔مگر موضوعات کے ساتھ شاید انہوں نے زبان کے ساتھ بھی تجربے کرنے کی کوشش کی ہے۔زبان کے مروّجہ اصولوں سے انحراف کر کے نئی راہ نکالنے کی کوشش کرنا مستحسن ہو سکتا ہے مگر بات ایک بار پھر زبان کے معیار پر آ کر رُک جاتی ہے۔یہ درست ہے کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق الفاظ کے استعمال میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔مثلاً اینٹی غزل نے انگریزی کے بہت سے الفاظ کو قبول کر لیا ہے اور شعراء نے کامیابی کے ساتھ انہیں برتا بھی ہے۔مگر انگریزی کے تمام الفاظ اس لغت کا حصہ نہیں بن سکے کیونکہ وہ اردو شاعری کے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔اسی طرح حیدر صاحب کے یہاں پنجابی اثر کے ساتھ لفظوں کے ایسے استعمال کی شعوری کوشش ہے جو نہ تو ہماری غزلیہ شاعری کے مزاج سے میل کھاتے ہیں اور نہ ہی زبان کے مروّجہ معیار پر

پورے اترتے ہیں، جیسے:

ہمیشہ ہی انکار اچھا نہیں
کبھی بات میری بھی مانی کرو

مرے ہی خواب کنوارے نہیں رہے، اب تو
کہ آرزوئیں تری بھی بیاہیاں نہ گئیں

اس پہ سارا معاملہ چھوڑا
اب ڈبوتا ہے، چاہے تارتا ہے

دِلوں کا خون کرنے لگ گئے ہو
بڑے سفّاک ہوتے جا رہے ہو

قطع نظر مندرجہ بالا نکات کے حیدر قریشی کی شاعری اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے دیارِ غیر میں اردو کا چراغ روشن کر رکھا ہے اور اس کی روشنی کو قائم رکھنے کے لیے اپنے قلم کے ساتھ زبان کو عصری تقاضوں اور جدید عہد کی ضروریات کے مطابق پروان چڑھانے کی بھی عملی کوشش کر رہے ہیں۔اس تعلق سے www.urdudost.com اور بہت ساری دوسری اہم سائٹس کے ذریعے ان کی اردو سے محبت کا عملی ثبوت دیکھا جا سکتا ہے۔

معاصر شاعری میں تازہ کاری اور تازہ دمی کی ایک نمایاں مثال حیدر قریشی اور ان کا کلام ہے۔آج کی شاعری پر ایک الزام یہ ہے کہ اس میں یکسانیت اور یک رنگی در آئی ہے۔۔۔۔میں آج کی شاعری پر فردِ جرم عائد کرنے والوں سے حیدر قریشی کے کلام کے مطالعے کی سفارش کروں گا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ حیدر قریشی کے استعارے، علامتیں، لفظیات اور موضوعات دوسروں سے الگ دکھائی دیتے ہیں یا نہیں۔حیدر قریشی نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔غزل گوئی سے تو ان کی بنیادی دلچسپی ہے ہی۔۔لیکن انہوں نے نظمیں بھی بہت اچھی کہی ہیں اور بعض نظموں کو پڑھ کر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ وہ غزل کے زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے۔
(**مظہر امام** کے مضمون ''عمرِ گریزاں کی شاعری''، مطبوعہ ''کوہسار'' بھاگلپور شمارہ: اگست ۱۹۹۹ء سے)

غزلیں، نظمیں، ماہیے

نذیر فتح پوری (پونہ)

’’غزلیں،نظمیں ماہیے‘‘ جناب حیدر قریشی کی پچیس سالہ شاعری کا انتخاب ہے۔ماہیے کے فروغ کے سلسلے میں حیدر قریشی کا نام چاروں اور خوشبو کی طرح پھیل چکا ہے۔اردو ماہیوں کو پنجابی وزن اور مزاج کے مطابق کرنے میں حیدر قریشی نے بنیادی کام کیا ہے‘ جو نا قابلِ فراموش ہے۔تاہم حیدر قریشی کی ذات کو صرف ماہیے کی تخلیق اور اس کے فروغ تک ہی محدود نہیں کر سکتے۔انہوں نے تخلیقی میدان میں غزل اور نظم کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا ہے۔کبھی کبھی تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ غزل‘ نظم اور ماہیا تینوں اصنافِ سخن میں سے وہ کس صنف صنف میں زیادہ نمایاں اور کامیاب ہیں۔مذکورہ کتاب ان کے چار شعری مجموعوں کا مجموعہ ہے:سلگتے خواب‘ عمرِ گریزاں‘ محبت کے پھول اور دعائے دل۔حیدر قریشی کا یقین ہے کہ جو شاعری ان پر نازل ہوتی ہے وہ محبت کے فرشتے کے وسیلے سے نازل ہوتی ہے۔شاید اسی لئے ان کی غزلوں میں خلوص کا عنصر غالب ہے۔غزل کا یہ انداز بھی حیدر قریشی کے لئے مختص ہے۔

آج حیدرؔ موڈ ہی کچھ اور تھا
سو غزل میں استخارہ کر لیا

وجود میرا اگر اس پہ منکشف ہو جائے
مجھے یقین ہے وہ خود سے منحرف ہو جائے

صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اداس
میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رُلاتا ہے مجھے

ہم نے ترے غم میں کوئی مالا نہیں پہنی
سینہ ہی دمکتے ہوئے زخموں کی لڑی ہے

کیسا جلا گئے ہو
بجھتا ہی جا رہا ہوں

اس کتاب میں ۱۴۰ غزلیں شامل ہیں جن میں حیدر قریشی نے زندگی کے سارے رنگ یک جا کر دیئے ہیں۔
کتاب کے دوسرے حصے میں ۲۷ نظمیں شامل ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ سب آزاد نظمیں ہیں۔اب پابند نظموں کا زمانہ نہیں رہا اور اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔بقول شاعر ان نظموں میں جتنی صدائیں ہیں وہ سب کی سب انہیں جانتی ہیں۔وہ خود بھی ان صداؤں کو جانتے ہیں‘ یہ سب ان کے درد کا اظہار ہے جو الفاظ کی صورت کاغذ پر اتر آیا ہے۔ان نظموں کی انفرادیت کا اندازہ قاری کو مطالعہ کے بعد ہی لگ سکتا ہے۔’’چاند کی تسخیر کے بعد‘‘ کے یہ ابتدائی مصرعے دیکھیں

لفظوں کو جستجو ہوئی اپنے وجود کی
مفہوم اپنے رشتے نئے ڈھونڈنے لگے
معنوں کی اک بساط بھی بچھنے لگی نئی
محبوب کے حوالے سے تفہیم چاند کی
اب صرف ایک قصۂ پارینہ بن گئی

ایک نظم ’’دعا‘‘ کا آخری حصہ ملاحظہ کریں:

مِرے مولیٰ!
تجھے معلوم ہے یہ کعبۂ دل تو ترا گھر ہے
سو اپنے گھر کے مالک‘ اپنے گھر کی خود حفاظت کر
اس اندھے ظلم کے عفریت کو
اور جبر کی اس رِیت کو پامال کر ایسے
کہ دنیا پھر ابابیلوں کے ہاتھوں
ہاتھی والوں کی ہلاکت کا نظارہ دیکھ لے مالک!

کتاب کے تیسرے حصّے میں ماہیے شامل ہیں جو الگ الگ عنوانات کے تحت تخلیق کئے گئے ہیں۔ یہ ماہیے جن کی تعداد دوسو (۲۰۰) ہے'۱۹ عنوانات دے کر تقسیم کئے گئے ہیں۔ بعض ماہیے مکالمے کی صورت میں ہیں۔ بعض میں گیتوں کا سا تسلسل ہے۔ حیدر قریشی نے ماہیوں کے توسط سے اپنے مولا کے حضور گزارشات بھی پیش کی ہیں۔ اور اپنے بیشتر رشتے داروں کو خلوص کے تحفے بھی پیش کئے ہیں۔ باغ میں ملنے والی ایک لڑکی کی داستان بھی بیان کی ہے اور سلگتے خوابوں کا نوحہ بھی لکھا ہے۔ وصال کے موسم' درد کی جاگیریں' پھول رُت اور عمرِ گریزاں کے تذکرے۔۔۔ وہ کون سا رس ہے جو ان ماہیوں میں موجود نہیں ہے۔ چند ماہیے ملاحظہ کریں۔

وہ ہاتھ دعا والے
جسم عطا والا
اور ہونٹ شفا والے

مسجد ہے نہ مندر ہے
دل یہ ہمارا تو
اک دکھ کا سمندر ہے

جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے
وہیں ڈال دیئے ڈیرے

۳۸۴ صفحات کی یہ ضخیم کتاب بے حد خوبصورت چھپی ہے۔

پوری کتاب (سلگتے خواب) مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا پن محسوس کیا۔ آپ کا ہر شعر قاری کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کرتا ہے کہ نہ صرف وہ اسے پڑھتا ہے بلکہ دل میں اتار لیتا لیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ **نجمہ منصور** (سرگودھا) کے تاثرات

(مطبوعہ ماہنامہ ''اسباق'' پونہ شمارہ: فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء)

حیدر قریشی کا افسانوی مجموعہ

روشنی کی بشارت

ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں (پہلی بھیت)

ترقی پسند تحریک نے بنیادی سطح پر نثر میں افسانہ اور تنقید کی اصناف کو بالخصوص فروغ دیا۔ یہ تحریک چونکہ نظریاتی اعتبار سے سماجی حقیقت نگاری کے باہری رخ سے زیادہ وابستہ تھی اور بیشتر تبلیغی موضوعات کا آلہ کار بنی رہی اس لئے صرف اپنی من کی دنیا آباد کرنے والی شاعری کی فضا میں اس کی قوت پرواز نمایاں نہ ہوسکی۔ جدیدیت کے عہد میں فنکار کے ذہنی رویے نے پھر پلٹا کھایا اور نثری اصناف پر بتدریج شعری عناصر غالب ہونے لگے۔ انشائیہ اور افسانے پر اس کے اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ اب نئے افسانے سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ اس میں خارجی حقائق پر مبنی نہ کردار ہیں، نہ ماحول اور زندگی بلکہ جو کچھ ہے وہ علامت نگاری کے تحت افسانہ نگار کی محض ذاتی ہذیان گوئی ہے جو شاعری سے مملو بے ربط محسوسات کا اظہار اور ابہام و اشکال کا شکار ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں نے ترقی پسندی کی ضد میں افسانے کا کچھ ایسا طریقہ کار بھی اختیار کیا کہ اس صنف کی اپنی زمین متزلزل ہوگئی۔ اس افراتفری کے عالم میں حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کی بشارت" بہت متوازن اور منفرد معلوم ہوتا ہے جس میں بھرپور علامتی، تمثیلی اور اشاراتی زاویوں سے کام لیتے ہوئے مصنف نے اپنے زمانے کے جدید مسائل اور سماجی، مذہبی، صحافتی اور شخصی احساسات کو آج کے نئے انسان کی مرکزیت اور اکائی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مجموعے میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے کے بعد قاری کو سب سے پہلے جو کلیدی کردار متوجہ کرتا ہے، وہ "شخص واحد" یعنی ایک "میں" ہے جس کے گرد ماضی، حال اور مستقبل کے صدیوں کے حالات،

افراد، واقعات اور رسوم و اعتقادات ایک جلتی ہوئی مشعل یا پھلجھڑی کی طرح آنکھوں کے سامنے گردش کرتے ہیں اور ہر منظر اتنا بامعنی ہے کہ اس کی تہوں میں سینکڑوں دنیائیں سمٹی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ "میں" آج کا نیا انسان ہے جو وسیع وعریض اور بیکراں کائنات کے مظاہر میں گم صم تماشائی کی مانند متحیر ہے۔تنہا، بے یارو مددگار اپنے تمام جماعتی نظام، اجتماعی شعور، جمہوری اژدہام اور عوامی گروہ بندی سے الگ تھلگ، قطعی دل برداشتہ --- لیکن اس تنہا "فرد" کے ساتھ ایک "روشنی" بھی ہے جو اس کے چاروں طرف ہالہ کئے ہوئے ہے اور راہ دکھاتی جاتی ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں اسی "پیغمبرانہ "روشنی کی تفسیر کی ہے، اس کی "بشارت" دی ہے۔ روشنی کی علامت اپنے استعاراتی اور تلمیحی زاویوں کے ساتھ تمام افسانوں کی فضا پر حاوی ہے۔ افسانہ نگار اس مقدس روشنی کے باب میں کھل کر اعلان نہیں کرتا کہ اس کا مرکز کیا ہے؟ اس کے سامنے آسمانی صحائف کی جگمگاتی تحریریں بھی ہیں، مفکروں اور پیغمبروں کی ہدایات و اقوال بھی اور خود اپنے ضمیر اور اپنی ذات کی پیدا کردہ برقی رو اور اس کا منور ہالہ بھی --- یہ فیصلہ خود قاری کو کرنا ہے کہ اس روشنی کا اصل منبع کہاں ہے؟ دوسری اہم بات ان افسانوں میں یہ ہے کہ موجودہ مشینی دور کی مادیت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے مسائل کی زندہ تصویروں کے متوازی شعور کی رو کے وسیلے سے افسانہ نگار نے انسانی تاریخ کے گم شدہ اوراق کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور تہذیب و تمدن کے تمام ارتقائی کارناموں پر طنز کرتے ہوئے اپنی اس روشنی کا سہارا لیا ہے جو حقیقی رہبر ہے اور جس کے ہالے میں حال و ماضی کے "سونے" کا سب کھوٹا پن سامنے آجاتا ہے۔ حیدر قریشی کرداروں کو پیش کرتے ہیں، وہ اپنے کرداروں کو عصری اور تاریخی احساسات سے اس طرح متحرک کر دیتے ہیں کہ ان کے شخصی نام کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ایک دو افسانوں کے علاوہ کہیں بھی کرداروں کا شخصی نام نہ ملے گا۔

آزادی کے بعد اشتراکی نظریات کے زیر اثر ہمارے افسانوں میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش اور حکمران طبقے کا بے جا استحصال واضح ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ہجرت، فسادات اور نئی جنسی الجھنوں کے موضوعات پر بھی بڑے کامیاب افسانے تخلیق کئے۔ آج حیدر قریشی کے افسانوں کا "میں " پھر انہیں مسئلوں سے نبرد آزما ہے---اس کے معاشرے میں مکروہات ہیں۔ زنا، اغوا، قتل وخون، جرائم، حادثے، عوامی انقلاب، جنگ، موت، زلزلے، سیلاب، طوفان، ایٹمی دھماکے، حکمراں طبقے کا جبر، طاقت کا ناجائز دباؤ، جائز حقوق کی پامالی،--- یہ ہے وہ کائنات جس کے شکنجوں میں حیدر قریشی اپنے کلیدی کردار کی حیرانی دکھانا چاہتا ہے۔ لیکن دوسری سمت یہ حیرت زدہ نیا انسان بالکل مایوس اور تہی دامن بھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک روشنی ہے، جو اسے حوصلہ دیتی ہے۔ یہ کردار اپنی پختہ عمر کے تمام تجربات اور مشاہدات کی تلخی کو بھول کر دوبارہ پھر وہی معصوم بچہ بن جانا چاہتا ہے جو

فطرت کے حسن کا شیدائی ہے جسے مکر وفریب پسند نہیں اور جو مصنوعی طور پر عائد کی ہوئی قید و گرفت سے آزاد رہنے کا متمنی ہے۔

حیدر قریشی کا یہ بنیادی کردار ایک محور ہے جس کے اطراف میں کائنات اور زندگی کا حالیہ تماشا ہی نہیں بلکہ گذشتہ قرنوں اور زمانوں کے عجیب وغریب مظاہر بھی ہیں جنہیں آج کا انسان یا تو بھولتا جا رہا ہے یا جن کی فرسودہ اقدار پر اب اسے اعتماد نہیں رہا۔ لیکن حیدر قریشی کے افسانے ہمیں پھر انہیں کھوئے ہوئے تاریخی مناظر کی طرف لے جاتے ہیں جہاں سادہ دل معصوم انسان حیات کے غیر مصنوعی طریق کو اپنا کر مطمئن تھا اور صحرائی تہذیب، جنگل کا خوفناک خونی نظام اور ازلی انسانی رشتوں کا جہاں راج تھا۔ یہ افسانے موجودہ عہد کے سنگین ماحول کے ٹوٹے ہوئے سروں کو اسی گذشتہ تمدن و معاشرت سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو آدم کا مقدر ہے۔ ان افسانوں میں ہم قدم قدم پر سوالیہ نشانات سے دوچار ہوتے ہیں--- آج کا مادہ پرست آدمی زندگی کو کیسے گزارتا ہے؟ اس کی خواہشات کے حدود کیا ہیں؟ دولت حاصل کرنے کی دوڑ میں نئے آدمی نے اپنی حقیقی مسرتوں کا کس طرح سودا کیا ہے؟ حکمراں بننے اور تمام کائنات کو اپنا غلام بنانے کا خواب اور اس کے عمل کے لئے صدیوں کی بنائی ہوئی اس آباد اور سرسبز زمین کو آنِ واحد میں نیست و نابود کر دینے کا ارادہ کتنا مضحکہ خیز ہے اور کس درجہ بھیانک؟--- لیکن بیسویں صدی کا آدمی یہ کچھ نہیں سوچتا۔ اس کے سامنے صرف دولت، عورت، جنس، ٹی وی اور کیسٹ کی دنیا ہے جس کے بے ہنگم سنگیت اور بے ترتیب عریاں رقص میں وہ خود کو کھو کر ایک خوش دل انسان کہلانا چاہتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں نے "روشنی کی بشارت "میں موجودہ آدمی کی اس خام خیالی کا پردہ بالکل چاک کر دیا ہے اور وہ تصویریں دکھائی ہیں جو بظاہر روشنی کی حامل ہو کر دراصل اندھیروں کی غماز ہیں۔

ہر لمحہ بدلتی ہوئی اور خراب سے خراب تر ہوتی ہوئی اس "دنیا" کو سنوارنے کی غرض سے افلاطون سے لے کر آج تک لاتعداد مفکر اور پیغمبر آئے اور انہوں نے سچائی کا راستہ دکھانے کی سعی کی۔ وید، انجیل اور قرآن کی تعلیمات کے باوجود انسان اس کائنات میں ابھی تک اپنی وحشی جبلتوں سے دست بردار نہ ہوسکا۔ حیدر قریشی اپنے افسانوں میں اسی دکھ کا ذکر کرتے ہیں۔ افسانہ "روشنی کی بشارت "میں یہی المیہ جھلکتا ہے۔ تمام مذہبی صحیفوں کی مقدس روشنیوں اور ان کے اقوال سے ترتیب دی ہوئی شاہراہوں کی راستی بھی اپنی رہبری میں ناکام معلوم ہوتی ہے۔ افسانہ کیا ہے؟ حقیقت کون سی ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ انسان حقیقی رہبر اور پیغمبر کی صورت صدیوں کی گردش کے ساتھ اس دنیا میں آتا رہا۔ گمراہ آدمیوں کے انبوہ کو بار بار سماوی آفات سے ڈرایا گیا، لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ قیامت کا یقین سورج کا سوا نیزے پر ہونا، ماں کا آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنا--- آج کے نئے آدمی نے ان

تصورات کی ماہیت کو جھٹلایا ہے، حالانکہ قدم قدم پر وہ ان کی صداقت کا احساس بھی کرتا جاتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانے انہیں کیفیات کا فنی اظہار ہیں اور اس انسان کی تصویر کشی کرتے ہیں جو اپنے منفرد شعور کی وجہ سے اپنے عہد سے بالکل جدا ہے۔ جو یا تو صدیوں آگے ہے یا صدیوں پیچھے ہے۔

''حوا کی تلاش''"پتھر ہوتے وجود کا دکھ""غریب بادشاہ""ماتا"اور"اندھی روشنی"وغیرہ افسانوں کے میڈیم سے حیدر قریشی مذہب کی اساطیری اور داستانی فضا کا احاطہ کرتے ہوئے مرد اور عورت کے جنسی رشتوں کی ازلی حیثیت کا اندازہ کرتے ہیں کہ انسان کی خود ساختہ سماجی اور معاشی قدریں کن کن زاویوں سے ماضی بعید کی غیر مہذب رسوم سے پیوستہ ہیں۔ مرد و زن کے بدنی رشتے جو اندرون میں جنس کی تہوں میں مستور ہیں۔"واقعتہً"اوپری سطح پر کیا رنگ لاتے ہیں۔ اس کشمکش کو حیدر قریشی اپنے افسانوں میں دکھانا نہیں بھولتے۔ آدم و حوا کا گناہ آج بھی نئی تہذیب میں عورت کی طرف سے جاری ہے۔ ماڈرن سوسائٹی کے پرور وہ جوڑے روشن ہال میں رقص و نغمہ کا مظاہرہ کرتے وقت اپنے باطن کی خباثتوں اور کثافتوں میں اس طرح کھوئے ہوئے ہیں کہ ان کے روبرو گناہ و ثواب کی تمام میزانیں الٹ پلٹ گئی ہیں۔ زندگی کا تضاد ان کے افسانوں کی روح ہے۔ انہیں"حوا" کی تلاش بھی ہے اور اس سے ملنے کے بعد وہ اسے چھوڑ دینا بھی چاہتے ہیں۔ یہ کشمکش حیدر قریشی کو جدید عہد کی عورت سے نفرت اور محبت کرنا سکھاتی ہے۔ انہیں اندھے پن میں روشنی اور روشنی میں اندھا پن، دکھائی دینے لگتا ہے۔"شجرِ ممنوعہ" اور " گندم" کی اساطیری علامتیں بھی اپنی معنویت پوری طرح واضح کرتی ہیں۔ ان افسانوں میں مذہب، سیاست، صحافت اور آرٹ پر اگر ایک طرف در پردہ طنز ہے تو دوسری جانب فطرت کے حسن لازوال کے وہ خزانے بھی ہیں جن میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی اور جو موجودہ مشینی عہد میں بھی روحانی مسرت کا باعث ہیں۔ حیدر قریشی ایک "بچے" کی نظر سے ان سب کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔

" گلاب شہزادے کی کہانی"اس مجموعے کا اہم افسانہ ہے۔ اس میں بھی داستانی اور تلمیحی رموز کا سہارا لیا گیا ہے۔ اور ان کے وسیلے سے انسان کے توہمات، جادو ٹونے، اور معجزاتی اعمال کی فضا کو علامتی رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ اور بیسویں صدی کے ترقی یافتہ زن و شوہر کی گھریلو زندگی کا نقشہ کھنچا ہے۔ جہاں " گھوڑی"بن کر بیوی نوکری کرتی ہے اور اپنے"باس" کی داشتہ رہ کر خوش ہوتی ہے۔ اسی طرح شوہر " گدھے" کی صورت مادی زندگی کا بوجھ ڈھوتا ہے---اس جگہ حیدر قریشی نے نئے زمانے کے کئی اہم مسائل اور ہماری جدید سوسائٹی کے بہت سے گندے پہلو دکھائے ہیں۔ جس میں خاندانی منصوبہ بندی جیسے مسئلہ کا نازک حصہ بھی شامل ہے۔ اسی کے ساتھ حیدر قریشی نے کائنات پر حکمراں طبقے کی اجارہ داری اور دولت حاصل کرنے کی اندھی دوڑ کے نتیجے میں پیاس سے مرنے والے

انسان کی مجبوری کو بڑی کامیابی سے ذہن نشین کرایا ہے۔ یہ نیا دولت مند آدمی " تیل کا چشمہ " پا کر بھی "پانی" سے محروم ہے۔ اور پیاسا تیل کے چشمے میں گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ حیدر قریشی کے تمام افسانوں میں ڈرامائی عناصر اپنی علامتی خوبصورتی کے ساتھ متاثر کرتے ہیں۔

"روشنی کی بشارت" حیدر قریشی کے افسانوں کا وہ مجموعہ ہے جو آج کے نئے افسانے کے ان تمام الزامات کو رد کرتا ہے جن کے تحت جدید افسانے میں بے ربط منتشر اور مبہم احساسات کو ایسی شاعرانہ زبان میں پیش کرنے کا چلن ہو گیا ہے جو ہذیان گوئی سے قریب ہے۔ ہمیں ان افسانوں میں مصنف نے اس حقیقی روشنی کی بشارت دی ہے جو ہر عہد میں انسان کو سچا راستہ دکھاتی رہی ہے اور جو آج بھی انسان کے ضمیر کا اجالا بن کر روشن ہے۔

حیدر قریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارہ کیا ہے اور سچائی کو نمایاں کیا ہے کہ Limit Situtation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہمارا افسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شاید اب تک غافل تھا۔ حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے.....حیدر قریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنتے ہیں اور ان کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسا رویّہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ **پروفیسر جیلانی کامران**

(حیدر قریشی کے افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' کے پیش لفظ سے ایک اقتباس)

حیدر قریشی کی کہانیوں کی دُنیا ایسے کردارں سے آباد ہے، سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے.... انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ و ثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔۔ حیدر قریشی کی کہانیاں کائناتی انسان، خدا، روح، ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ ایسی کہانیاں اُردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ کسی ایک مصنّف کے ہاں ایسی ایک دو کہانیاں نظر آ جائیں گی لیکن کوئی ایک ہی مصنّف ان ازلی سوالوں، نظریات اور حسیّات سے جھوجھتا رہے، ایسا کوئی دوسرا کہانی کار میری نظر میں نہیں.... حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں۔ **دیویندر اسّر**

(حیدر قریشی کے افسانوں کے ہندی ایڈیشن ''میں انتظار کرتا ہوں'' کے پیش لفظ سے اقتباس)

حیدر قریشی کے افسانوں میں برتاؤ کی توانائی

(''قصے کہانیاں'' کے افسانوں کے حوالے سے)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

حیدر قریشی کے افسانے میں تجربے کا نقش ہے' مشاہدے کی باریکی ہے' زندگی کے فلسفے کی جھلک ہے اور اشارات و کنایات ہیں۔ ساتھ ہی تفہیم کی فکر نمایاں ہے۔ بیانات قاری یا سامع کو ایک طرح کی خود اختیاری سچویشن میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ حالات سے اثر کو تلاش کرے۔ یہ خود اختیاری (option) کی صورت پرانے افسانہ نگاروں کے ابلاغ سے الگ ہے اور جدیدیوں کے خود میں گم ہو جانے والی ترکیب (device) سے جدا ہے۔ اس طرز میں نہ غصہ ہے' نہ جھنجھلاہٹ' نہ الزام تراشی' بس ایک گہرا تاثراتی بیان ہے جو ذہن کے خانوں سے ہوتا ہوا واقعات میں پھیل جاتا ہے۔ ورنہ بقول سجاد عزیز: ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کے زیرِ اثر ابھرنے والے افسانوں میں فکری و فنی سطح پر انحراف کی واضح اشکال نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ اقدار کی لمحہ لمحہ شکست و ریخت' ذات کا بحران' بے چہرگی کا المیہ' ماحول سے بے چینی' تنفر اور بے زاری' انفرادی و اجتماعی کوفت اور خوف و دہشت' معاشی ناہمواری اور طبقاتی تضادات' بے رحم سرمایہ دارانہ استحصال' بے گانگی اور سیاسی جبر و استبداد وغیرہ فکشن میں نئے رویوں اور رجحانات کے نفوذ کا باعث بنے۔ یہ رویّے اور رجحانات بڑی حد تک حقیقی اور فکری تھے۔ کیونکہ یقین اور اعتماد کے جن احساسات اور خیالات کا اظہار ادیب اب تک کرتا آ رہا تھا' انہیں واقعات اور حالات کے الم ناک نتائج نے کاری ضرب پہنچائی تھی۔ اس ضرب کے نتیجے میں فکر اور فکری اظہار کے طریقے بدلے تو فنی اظہار میں بھی قابلِ قدر اور اہم تبدیلیاں آئیں۔ اشاراتی' تمثیلی' اسطوری' علامتی اور تجریدی نوعیت کے تجرباتی اسلوب ہی موزوں قرار پائے گئے۔ نیا افسانہ نگار بے باکانہ اور جرأت آزما تخلیقی' فکری و فنی کاوشوں کو پیش کرتا رہا۔ مگر جب ذکر کردہ منفی

رویّہ اور رجحان ۱۹۶۵ء کے بعد کافی شدّت اختیار کر گیا اور بہتیرے افسانہ نگاروں نے محض منفی احساس و فکر کو ہی افسانہ نگاری کا مقصد و منتہا سمجھ لیا تو نتیجے میں اس وقت کی افسانوی معنیات اور لفظیات پر خوف دہشت' ہراس و بے چینی کی فضا منڈلانے لگی اور زندگی کے حقیقی معنی (اور مثبت عناصر) ایک مخصوص بھیانک اور خوفناک ماحول کے نیم لاہیئتی اور نیم لاواقعاتی پس منظر میں ڈوب گئے۔ افسانہ یکسانیت اور اعادے کا شکار ہونے لگا۔

جدید فطری احساس' فطری بصارت اور زندگی کی نئ قیمت' عکس یا تجربے کے نام پر افسانوی سفر' زندگی سے موزونیت کی طرف' اعتماد سے بد اعتمادی کی طرف بھی طے ہونے لگا۔ بے تعلقی' بے زاری' اعتراض' ذہنی اضطراب' لمحاتی نظریہ وغیرہ آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

روایت سے مکمل انارکی' ترکِ تعلق اور قابلِ بیان وضع وحُسن میں اپنا دعویٰ بھی اس وقت تک کی کہانی پیش کرتی رہی۔ اسی کو کچھ لوگ کھینچ کر افراط تک لے گئے۔ ایک خاص (بنا بنایا) ماحول جس میں خوف اور دہشت کی ہلکی ہلکی ہوا بہہ رہی ہو' پردہ اٹھتے ہی کوئی اجنبی سا ''وہ'' خاص ادا اور انداز سے' کہیں سے آتا' کچھ کرتا یا سوچتا دکھائی دے۔ جسے بار بار لگتا رہے کہ کہیں کچھ ہو رہا ہے۔ ''کچھ نہیں'' ہوتے ہوئے بھی کچھ ہو رہا ہے۔ کوئی اسے گھیر رہا ہے۔ اور یہ سب کرنا' سوچنا ایسا ہو جس میں کوئی منطق یا موزونیت نہ دکھائی دے۔ اور کام اور فعل اور کہانی کے ''پیرا'' کے بیچ کچھ کچھ ''ابسرڈ'' سا لگتا رہے۔ جہاں یہ ''ابسرڈ'' کا احساس کم یا پھیکا ہونے لگے وہاں کہانی خالص ''ا''نہیں ہے اور چاہے وہ کچھ بھی ہو۔

''وہ'' کا طریقۂ کار' گفتگو اور غور و فکر کا ایک خاص ڈھرا (پیٹرن) ہے کہ زندگی میں منطق اور مقصد کی ''مینگ'' نہیں ہے۔ یہ سارے ''وہ'' اپنے مصنفوں کے برابر ہی' کسی منظر میں یقین (اعتماد) نہ کرتے ہوئے ایک خاص ڈھنگ سے سوچنے' بولنے یا عمل کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے شاید ایک'' افسانہ'' پڑھنے کے بعد دوسری ''اکہانی'' کا ''وہ'' شناسا لگنے لگتا ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں کا کہنا ہے کہ آج کے سماج میں آدمی کی ''آئیڈینٹیٹی'' کھو گئی ہے۔ آدمی کو آدمی نہیں پہچانتا۔ سبھی اجنبی لگتے ہیں۔ اسی لئے ناموں کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا ہے۔ دوسرا بھی اپنے سے معمولی دوسروں کے لئے اتنا ہی غیر اہم ہے جتنا پہلا۔

کہانی کا قائد نہیں ہوتا۔ ان کی جگہ پر جو کچھ بھی نام سے عاری اجنبی ''وہ'' ہوتا ہے اسے یا تو اپنے آپ میں ہی اتنی دلچسپی رہتی ہے کہ وہ اپنے آگے پیچھے کی خبر لینا نہیں چاہتا۔ خود کے علاوہ سارا احساس اس کے لئے بے کار ہے۔ ساتھ ہی اپنے گھر سے زیادہ اپنے پڑوسی کے گھر میں دلچسپی رکھتا ہے اور برابر تاک جھانک کرتا رہتا ہے' یا تو اپنی بیوی سے اوب کر' یا اپنی فطرت (عادت' مزاج) سے مجبور ہو کر یا صرف تبدیلی کے 'ہیومر' کے لئے۔ مگر دوسروں

کی (شاید ادبی ہوئی) بیوی سے، جس کی ''حقیقت'' اکثر وہ دیکھتے ہی بھانپ لیتا ہے اور بہ آسانی شناخت قائم
کر لیتا ہے۔ دوسروں کے آپسی تعلق کی گہرائی اور استقامت کی چھان بین میں وہ لگا رہتا ہے اور زیادہ جانے بغیر
ماحصل پر پہنچ جاتا ہے۔ شاید اپنے شخصی تجربے کی بنیاد پر کہ وہ بھی ویسے ہی کھوکھلے ہوں گے۔ اکثر موقع کی تلاش
میں بھی رہتا ہے کہ کب شوہر باہر ہو اور اس کی بیوی سے وہ کوئی ''افیئر'' شروع کر سکے۔

''فارم'' کو ایک طرح سے ''ا۔کہانی'' نہیں مانتی۔ فن کو وہ کہانی کی فطری توضیح میں رکاوٹ مانتی ہے۔ بات جیسی بھی
ہے بغیر لاگ لپیٹ کے جیوں کی تیوں، سیدھی سادی کہہ دی جائے۔ چاہے بالکل بدشکل اور بے کیف زبان میں ہی
کیوں نہ ہو کہ نئی کہانی میں کثرتِ فن کا ردِعمل فطری ہی تھا۔ مگر اس حد (ایکسٹریم) تک نہیں کہ فن کی ساری اہمیت
اور تاثیر سے ہی انکار کر دیا جائے۔ کہانی کے ''بے فن'' کے بارے میں ''ا۔افسانہ'' کے اصرار اور فنی بغاوت کے نام
پر ایسی ایسی تخلیق پڑھنے میں آنے لگی کہ ایک عجیب سا اوب اور عجیب سی بیزاری محسوس ہونے لگی۔ اکثر کہانی وہیں
کی وہیں چھوڑ دینی پڑتی اور شاید نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار لگتا کہ اس سے بامعنی کہیں کچھ اور بھی تھا جہاں دماغ اور
وقت لگایا ہوتا۔ یوں تو ادب میں اور افسانوی ادب میں تجربہ کے نام پر اکثر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے مگر اس طرح
کے ''ڈرامائی لٹریچر'' کے بارے میں بھی اعتقاد بنائے رکھنے کے لئے شاید کسی اور 'ٹریننگ' کی ضرورت ہو۔

واقعہ سے ''ا۔افسانہ'' کو خاص چڑ ہے۔ واقعہ کچھ نہیں ہے۔ شاید روزمرہ کی زندگی میں جو کچھ گزرتا رہتا ہے اور جس
میں کبھی کچھ اتنا اہم ہو بھی جاتا ہے کہ باقی ساری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ اس سب میں ''واقعہ یا سانحہ'' کچھ نہیں ہے
۔ جنسی رشتے سے متعلق ''بیڈ روم ڈائری نما'' جیسی تخلیق بھی پڑھنے کو ملتی رہی۔ جن میں علاوہ ردِعمل کے ایک اور
زبردست ردِعمل یہ ابھرتا ہے کہ اگر یہ سب ادب مان لیا جاتا ہے تو پھر فٹ پاتھ پر فروخت ہونے والے ''ہاٹ
لٹریچر'' سے ہی اتنا پرہیز کیوں؟ تب جاسوسی ادب اور جنسی ادب کا بھی شمار اور ذکر کیوں نہ ہو؟ ایک اور آواز
آبسیشن کی ہے جسے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے افسانوں نے بہت تلخ بنا دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج کی زندگی کی پیچیدگی
اور ناموزونیت نے فرد کو کسی حد تک خود پسند بنا دیا ہے۔ وہ ہر دم کسی نہ کسی خیال یا واقعہ سے ''آبسیڈ'' رہتا ہے۔ یا تو
ماضی اسے گھیرے رہتا ہے یا خوش آئند مستقبل کی خواہش میں گھرا رہتا ہے۔ ویسے کئی جدید افسانہ نویسوں نے یقیناً
اس ''آبسیشن'' کو صحیح اور مناسب طور پر ظاہر کیا ہے۔

ایسی بے راہروی کے شکار اردو کے بیشتر افسانہ نگار ہوئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ''افسانے کی حمایت
میں'' لکھ کر اس کا اعتراف کیا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ وہی چند گھسی پٹی
علامتیں جن کا مفہوم خود انہیں بھی ٹھیک سے نہیں معلوم، وہی پُر تکلف اندازِ بیان اور وہی زندگی سے بے زاری۔ جو

برائیاں آج سے پندرہ بیس سال پہلے کے افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز تھیں اور جن کی وجہ سے ان پر لعن طعن ہوتی تھی
آج کے افسانہ نگاروں میں بھی نمایاں ہیں۔ پچھلے افسانہ نگار تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح جان بچا کر نکل گئے لیکن آج
کی نسل کا خدا ہی حافظ ہے۔ کہانی مر چکی ہے۔ اب اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا چاہئے اور آج کے افسانہ نگاروں
کو اس کے ساتھ دفنا دینا چاہئے۔ شاید ایسی ہی بے راہروی کو سامنے رکھ کر مہدی جعفر نے بعض سوالات اٹھائے
تھے کہ:

کیا یہ ضروری ہے کہ تجریدی اور علامتی افسانے ہی دراصل افسانے ہوں گے؟ کیا عصر حاضر کی شہری اور دیہی
حسیات مختلف ہیں؟ یا داخلی طور پر دونوں ایک ہیں؟ کیا نئی زبان کی تشکیل میں داستانوی زبان کی بازیافت ضروری
ہے؟ یا نئی علامتی اور استعاراتی زبان کی تخلیق اس لئے ضروری ہے کہ آج کی حسّی اور جذباتی روش پہلے سے بہت
مختلف ہے اور کیا افسانہ نئے بیانیہ کی صورت میں ہی آگے بڑھ سکتا ہے؟ کیا علامت کا مافوق الفطرت اور مافوق
البشر ہونا ضروری ہے؟ کیا علامت بہت زیادہ واضح ہو جانے پر استعارے میں بدلنے لگتی ہے؟ کیا اسے بہت
زیادہ واضح کرنے کے بجائے ہلکے طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدھم روشنی کا وسیلہ بنی رہے؟ کیا نیا علامتی
بیانیہ اس سلسلے میں معاون ہو سکتا ہے؟ کیا طویل افسانہ فنی طور پر مختصر افسانے سے بڑا ہوتا ہے؟ کیا تجریدی اور
علامتی افسانہ حقیقتاً اجتماع سے کٹا ہوا ہے؟

کیا تجریدی اور علامتی افسانہ نگار قاری پر اپنی زخم خوردگی اور کثافت مرتسم کرتا ہے، یا اپنی ذات پر ان کیفیات کو جھیلتے
ہوئے طنز، طلسم اور تحیر جگانے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا تخلیق دریافت شدہ تکنیک اور ٹریٹ منٹ کی میکانکیت اپنا لیتی
ہے یا اپنی تکنیک اور ٹریٹ منٹ کی الگ راہ نکالتی ہے؟

مگر بقول ڈاکٹر وزیر آغا کردار یا شخصیت کے غائب حصے کی تلاش افقی سطح ہی پر نہیں، عمودی سطح پر بھی ہوئی۔ عمودی
سطح کی یہ تلاش دراصل جڑوں کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ افسانہ نگار قطعاً غیر شعوری طور پر کردار یا شخصیت کی ان جڑوں
کی بازیابی میں مصروف تھا جو زیرِ سطح وقت کے اندر اتری ہوئی تھیں۔ افقی سطح پر کردار کی تکمیل کا مسئلہ زیادہ سے
زیادہ اخلاقی اور معاشی نظم وضبط کو بحال کرنے یا پھر ایک طرح کے بھرت ملاپ کا نظارہ کرنے کا عمل تھا، تاکہ
شخصیت کے دونوں حصوں میں فراق اور دوری کی صورت باقی نہ رہے۔ مگر عمودی یعنی vertical سطح پر کردار کی
تکمیل سفرِ شب (night journey) کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اور مزاجاً یہ سفر اسطوری نوعیت کا تھا جس میں انسان
ہمیشہ سے مبتلا رہا ہے تاکہ باہر کے جہان کو اپنے اندر کے جہان سے منسلک کر سکے۔

کچھ حد تک ۱۹۷۰ء کے بعد، بہت حد تک ۱۹۷۵ء کے بعد اور بہت زیادہ حد تک ۱۹۸۰ء کے بعد اردو افسانے میں

ذات کے اندر سفر کرنے اور یوسفِ گم گشتہ کو تلاش کرنے کا عمل بہت نمایاں رہا ہے اور بے راہروی کے شکار افسانہ نگاروں نے بھی خود کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔

حیدر قریشی اپنے افسانوں میں بے راہروی کے شکار کبھی نہیں رہے۔انہوں نے اعتدال پسندی پر توجہ مرکوز رکھی ہے اور موضوع‘ اسلوب‘ تیکنیک‘ زبان اور مواد ہر لحاظ سے نیا پن اور نئی آویزشوں کے مابین زندگی کی حرارت اور بوقلمونی پیدا کی ہے۔انہوں نے ایٹمی جنگ کے متوقع خطرے کا ادراک کر کے اس کے مابعد کی فضا پر تین کہانیاں لکھی ہیں۔اس طرح کی کہانیوں سے اردو کا قاری شاید پہلی بار چشیدہ ہوا ہے۔ان کا پہلا افسانہ ’’حوا کی تلاش‘‘ ماہنامہ ’’اوراق‘‘ لاہور کے فروری‘ مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔اسی موضوع پر ان کا دوسرا افسانہ ’’گلاب شہزادے کی کہانی‘‘۔۔۔’’اوراق‘‘ کے ہی اپریل‘ مئی ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔یہ دونوں افسانے ان کے افسانوی مجموعہ ’’روشنی کی بشارت‘‘ میں شامل ہوئے۔اور تیسرا افسانہ ’’کاکروچ‘‘ (مطبوعہ ماہنامہ ’’صریر‘‘ کراچی فروری ۱۹۹۲ء) بھی سائنسی ممکنات کے بیان پر مشتمل ہے۔اس کا ایک کردار مسعود شاہ کہتا ہے:

’’تم اب تک اسی موضوع پر پہلے ہی دو کہانیاں لکھ چکے ہو۔اس موضوع کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ لگتا ہے ایٹمی جنگ کرا کے ہی رہو گے‘‘

لیکن حیدر قریشی ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان کی کہانی سناتے ہیں۔جب زمین پر از سرِ نو آدم وحوا کی کہانی شروع ہوتی ہے۔یہ آدم وحوا صاحبِ اولاد ہوتے ہیں۔اور ان کی اولاد بھی صاحبِ اولاد ہوتی ہے۔ان کے پوتے‘ پوتیاں اور نواسے‘ نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم تر ترقیات کے دور سے نکل کر جنگل کے دور میں آ گیا ہے۔جہاں نہ کار ہے‘ نہ ہوائی جہاز ہے۔نہ ریڈیو‘ ٹیلی ویژن‘ ٹیلی فون یا فیکس ہیں۔ایسے میں حیدر قریشی یہ سائنسی نکتہ بیان کرتے ہیں:

’’سطح زمین پر ایٹمی جنگ کی صورت میں کوئی ذی روح مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔صرف وہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے جس میں Nuclear Poison ہو۔کیونکہ صرف یہی Element ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے۔مثلاً Lead ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے‘ لیکن اگر انسانی خون میں Lead شامل ہو تو پھر اسے ہلاک کرنے کے لئے ایٹمی جنگ کی بھی ضرورت نہیں‘ انسان ویسے ہی مر جائے گا‘‘

’’آپ کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لئے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔لیکن بعض ذی روح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے۔مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی الگ تھیلی ہوتی

۔اس لئے اگر اس کے جسم میں nuclear poison ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہوگی‘‘

اتنا سننے کے بعد نصیر حبیب مشورہ دیتا ہے:

’’مکھی کی جگہ کاکروچ لے لیں۔فرض کر لیں کہ کاکروچ کے وجود میں ایسا سسٹم ہے کہ تابکاری اثرات اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا اس کی Growth کرتے ہیں۔لہٰذا ایٹمی جنگ کے بعد سارے ذی روح مر جائیں گے سوائے کاکروچ کے۔اور تابکاری اثرات سے جب ان کی Growth ہوگی تو آنے والے زمانے میں اس زمین کے حکمراں اور مالک یہی کاکروچ ہوں گے جو انسانی قد کے برابر ہو جائیں گے‘‘۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

’’دوستو! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں‘‘ (کاکروچ)

ایٹم کی اندرونی ساخت میں لا انتہا ذرے محوِ رقص ہوتے ہیں۔جن سے ایٹم بم‘ ہائیڈروجن بم‘ اور ثقلی بم (gravitational bom) بنائے جا چکے ہیں اور دنیا کے نابود ہونے کے امکانات سامنے آ رہے ہیں۔آج مادہ زدہ دنیا میں امن کی تلاش ایک بے معنی اور لا حاصل عمل ہے۔انسانوں کے درمیان سے خود غرضی اور جبلی بہیمیت کم نہیں کی جا سکتی۔نسلی امتیاز‘ ملک وقوم کے مابین تفوق و برتری کے حاوی احساسات کا اندمال نہیں کیا جا سکتا۔مادہ کے میکانکی عمل سے رُستگاری حاصل نہیں کی جا سکتی۔مذہبی اور اخلاقی قدروں کو از سرِ نو اس دورِ عقلیت میں زندہ نہیں کیا جا سکتا۔انسانیت کو اس قدر رفیع بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جذبۂ بے لوث کو جلا مل سکے۔اس قدر برخلاف حالات کے باوجود حیدر قریشی پائدار امن کے متلاشی ہیں۔وہ مہیب جنگ اور حقیر انسان کو آنک رہے ہیں اور جوہری توانائی سے جنم لینے والی بے چینی کو افسانے کا رُوپ دے رہے ہیں۔ساتھ ہی سکون بخش روشنی کی بشارت دے رہے ہیں کیونکہ دین‘ دنیا‘ محبت اور خدا ہی سب کچھ ہے۔ان کے ایک افسانے کا پیر سائیں بتاتا ہے:

’’محبت کے چار سفر ہیں۔کامیابی کے لئے یہ سفر ضروری ہیں:

محبّ سے محبوب کی طرف۔۔۔۔۔۔۔محبوب سے محبّ کی طرف

محبّ سے محبّ کی طرف۔۔۔۔۔۔۔محبوب سے محبوب کی طرف

دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔تمام عوالمِ الٰہی کو سمجھ کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔عوالمِ الٰہی کو بھی چار حصوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔:

پہلا عالَم، عالَمِ زمان ہے۔ یہ ایسا عالَم ہے جس کی ابتدا اور انتہا دونوں معلوم ہیں۔
دوسرا عالَم، عالَمِ دہر ہے۔ اس عالَم کی ابتدا معلوم مگر انتہا نا معلوم ہے۔
تیسرا عالَم، عالَمِ سرمد ہے۔ اس کی ابتدا بالکل نظر نہیں آتی مگر انتہا سمجھ میں آتی ہے۔
چوتھا عالَم، عالَمِ ازل ہے۔ اس کی نہ ابتدا کا پتہ ہے نہ انتہا کی خبر ہے'' (روشن نقطہ)

حیدر قریشی نے آج کے انسان کی بھول بھلیوں کا حل تلاشنے کے لئے توحیدِ خداوندی پر کامل یقین و ایمان کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ لیکن توحید کا بھید جاننے کی سعی سے گریز کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے' کیونکہ:

''جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔۔۔اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہوتا ہے۔ کیونکہ ''بے مثال'' کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا۔۔اور جو توحید کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے' کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور۔۔۔جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے'' (روشن نقطہ)

دوسری طرف حیدر قریشی سیاسی' تہذیبی اور ثقافتی سطح پر رُونما ہونے والے انقلاب کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سامنے زندگی روایتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جس کے ایک طرف زنگ آلود قدروں کا دریچہ ہے تو دوسری جانب ایسا طلسم ہے جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ انہوں نے دادی اماں سے جو کہانیاں سنی تھیں ان کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ جس جنگل میں شہزادہ پر اسرار ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑا کر سپنوں کی شہزادی کے باغ میں پہنچ جاتا تھا' وہاں اب فیکٹری نظر آتی ہے۔ اور فیکٹری بھی کیسی:

''آج کارخانے کی چمنی سے اُٹھتے ہوئے گہرے سیاہ دھوئیں کو دیکھ کر میں نے سوچا ہے کہ ابھی اس میں سے ایک جنّ نمودار ہوگا اور میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر درخواست کرے گا ''کیا حکم ہے میرے آقا؟'' اور پھر میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ میرے چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ لیکن جن کی بجائے سامنے سے کارخانے کا سخت دل اور کرخت زبان مالک آ جاتا ہے۔ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔''

(دو کہانیوں کی ایک کہانی)

اس افسانے کا میں' پیر جی' شاہ جی' کارخانے کے مالک اور کارخانے کی رہائشی کالونی کی لڑکی زلیخا کے درمیان خود کو بے بس محسوس کرتا ہے اسی لئے کارخانے کی نوکری چھوڑ دیتا ہے:

''کارخانے کی چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی سیاہی دیکھ کر سوچتا ہوں' اس میں میرا لہو بھی شامل ہے تو پھر دھواں اتنا سیاہ کیوں ہے؟ جن کا خون سفید ہو چکا ہے وہ میری سلامتی کے علمبردار ہیں۔ چمنی سے نکلتا ہوا گہرا سیاہ دھواں

ان کی طرف سے میری حمایت میں سوگ کی علامت ہے۔ لیکن میرے سفید و سیاہ پر سارا اختیار انہیں کو حاصل ہے۔ الہٰ دین کا چراغ میرے ہاتھ میں ہے لیکن اب اس کی روایت بدل چکی ہے' اب جنّ کے احکامات کی بجا آوری الہٰ دین کا فرض ہے۔ چمنی سے اٹھتے سیاہ دھویں کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ شاید چراغ کا جنّ ابھی حاضر ہونے والا ہے۔ میں اس کے احکامات کی تعمیل کے لئے پہلے ہی مؤدب ہو کر کھڑا ہو جاتا ہوں''

لیکن دوسری طرف شاہ جی کے پیر جی کا کردار ہے جو علم و معرفت کی باتیں کیا کرتے ہیں اور اپنے مرید شاہ جی سے کہتے ہیں کہ خدا سے براہ راست گفتگو کرا سکتے ہیں مگر اس کے لئے ان کی شرط ہے کہ ''خدا سے بات کرانے کے عوض انہیں ایک سجدہ کیا جائے۔'' (دو کہانیوں کی ایک کہانی)

انسانی کردار کی اس خواہش کا اظہار کرتے وقت حیدر قریشی کو افسانے کے فن میں ڈوبنا پڑا ہے۔ غوطہ لگانا پڑا ہے۔ حیدر قریشی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود پر کسی بھی طرح کا دروازہ بند نہیں رکھنا چاہتے بلکہ سارے دروازے' کھڑکیاں اور جھروکے کھول دینا چاہتے ہیں اور اپنے زمانے کے کھوکھلے ہوتے ہوئے باطن اور اطراف و جوانب میں چشم بصیرت کو محسوس ہونے والی تاریکی کے باوجود' شعلۂ تخلیق کو روشن رکھنا چاہتے ہیں:

''چوہدری اللہ دتہ صاحب ویسے تو بڑے متقی انسان ہیں۔ سچی بات ہے میں نے ان میں عیب اور گناہ والی کوئی بات نہیں دیکھی۔ پر اب تہتر برس کی عمر میں انہوں نے نئی شادی کر کے بڑی زیادتی کی ہے۔ بوڑھوں میں ہی نہیں' جوانوں میں بھی ان کی ٹور تو بن گئی ہے کہ اس عمر میں بھی اتنا دَم خم ہے کہ نئی شادی کر لی۔ پر ایسی ٹور کا فائدہ؟۔ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ جب تہتر سال کی عمر میں بھی چوہدری اللہ دتہ صاحب سے صبر نہیں ہو سکا تو پھر اُس زمانے میں اُنہوں نے خاک صبر کیا ہو گا۔ جب وہ کئی کئی برس بیرون ملک اکیلے گزار کر آتے تھے۔ تب تو وہ اچھے بھلے جوان تھے۔ ضرور اِدھر اُدھر منہ مارا ہو گا لیکن مہارت کے ساتھ۔'' (بھولے کی پریشانی)

بڑھاپے کی شادی اور اِدھر اُدھر منہ مارنے کے موضوع پر بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں لیکن حیدر قریشی کا کمال فن یہ ہے کہ وہ کہانی کے باطن میں جھانکتے ہیں اور پرت در پرت ادھیڑتے چلے جاتے ہیں۔ اب اسی افسانے ''بھولے کی پریشانی'' سے یہ اقتباس دیکھئے:

''چودھری اللہ دتہ صاحب نے دوسری شادی بھی کی تو کیسی فضول سی جگہ۔۔۔ یہ عورت گو عمر میں ان سے بیس سال چھوٹی ہے لیکن پہلے ایک جج کی بیوی رہ چکی ہے۔ جج نے اس پر برائی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے دی تھی۔ اور وہ عورت۔۔۔ابراہیم کی بیٹی' جو نئی چوہدرانی کی گہری دوست ہے' منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ اس نے شادی والے دن چوہدری اللہ دتہ صاحب کو سالی بن کر دودھ پلایا تھا اور دودھ پلائی کے پیسے لئے تھے۔ نئی چوہدرانی کی یہ منہ

بولی بہن اپنے گاؤں کی وہ تاریخی لڑکی ہے جو اپنی جوانی میں گاؤں سے بھاگی تھی۔کسی لڑکی کے گاؤں سے بھاگنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔کم بخت بھاگی بھی غیر مذہب والے کے ساتھ۔‘‘

’’ایک کہہ رہا تھا کہ نکاح کے چھوہاروں اور مکھانوں کے ساتھ ٹافیاں اور غبارے کیوں تقسیم کئے گئے؟ کیا پتہ کیوں تقسیم کئے گئے!‘‘

’’چوہدری اللہ دتہ صاحب اندر سے بالکل خالی ہیں۔پھوکی ٹَور بنانے کے لئے انہوں نے شادی کا تماشہ کیا ہے۔۔۔اگر واقعی چوہدری میں دَم خَم ہے تو پھر اس بیوی سے بھی اولاد پیدا کر کے دکھادیں۔‘‘

’’کل رات چوہدری اللہ دتہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ ان کے بیڈ روم کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کر دوں۔انہوں نے مجھے اپنے بیڈ روم تک پہنچایا تھا اور دروازے سے ہی لَوٹ گئے تھے۔میں اندر گیا تو وہاں نئی چوہدرانی بیٹھی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔میرے قریب آ گئیں۔ان کی آنکھیں اور چہرہ بڑا عجیب سا ہوتا جا رہا تھا۔اب میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا کرنے لگی تھیں۔جب وہ مجھ سے بالکل ہی لپٹ گئیں تب میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا۔لیکن بدحواسی میں مجھ سے دروازہ نہیں کھل سکا اور میں قریب کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا‘‘

بعد میں بھولے نے دیکھا کہ بیڈ روم کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے اور کل رات سے چوہدری صاحب اچانک کہیں چلے گئے ہیں۔

ذہنی، جنسی اور نفسیاتی مسئلے پر یہ افسانہ بھرپور تاثر رکھتا ہے۔دماغ کو جھنجھوڑنے کی قوت اس میں ہے۔دراصل حیدر قریشی زندگی کو اجتماعی نقطہ ءنظر سے دیکھنے کے بجائے یہاں خالص ذاتی سطح پر دیکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا نقطہ ءنظر شخصی ہے۔وہ تفرد پسندی کے حد درجہ قائل نظر آتے ہیں اور انفرادی ردعمل کو محرک قرار دیتے ہیں۔یہ سماجی شعور اور انسانی ہمدردی سے متصف ہونے کی صلاحیت حیدر قریشی میں بدرجہ ءاتم موجود ہے۔

حیدر قریشی کا ایک دلدوز افسانہ ’’شناخت‘‘ ہے۔اس افسانہ کے ذریعہ وہ زمانے کے تیز رفتار ناچتے ہوئے پیکر سے ٹکرانا چاہتے ہیں، لِج لجے پن کو دور کرنا چاہتے ہیں۔اور خون میں گرمی لا کر نئی جہتیں متعین کرنا چاہتے ہیں۔کیونکہ آج کا عہد مکمل انتشار کا ہے۔اس انتشار کے بحران سے کردار کا بحران پیدا ہوا ہے جو نہ صرف قومی آشوب ہے بلکہ عالمی المیہ ہے اور پوری دنیا کے لئے لمحہ ءفکر یہ ہے۔’’شناخت‘‘ کی کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ملک کا بٹوارہ ہوا اور ہر چہار طرف آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا۔بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، گاجر مولی کی طرح کاٹی گئیں۔اسی اتھل پتھل میں رشیدہ قافلے سے بچھڑ گئی۔وہ مسلمان تھی اور پاکستان کا مطلب لا الہٰ الا اللہ جانتی تھی۔وہ اپنے قافلے، اپنی ماں کی تلاش میں بھٹک رہی تھی کہ سکھ بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔وہ اسے ایک خالی

مکان میں لے گئے اور بقول حیدر قریشی:

’’لیڈر سکھ نے باقی سکھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔تشدد کے باوجود اسے اصرار تھا کہ وہ رشیدہ ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس یا پھر پاکستان پہنچایا جائے۔تب سکھ لیڈر نے نہ صرف اس کی آبروریزی کی بلکہ اس عمل کے دوران اسے باور کراتا رہا کہ وہ اب رشیدہ نہیں، پرکاش کور ہے۔کیونکہ اب وہ مسلمان نہیں، سکھ ہے۔تکلیف اور اذیت کے عالم میں ’’پاکستان زندہ باد‘‘

’’جئے ہند‘‘ اور ست سری آکال کے سارے نعرے بھی اسے ریپ کرتے رہے اور اسے اس کا نیا نام یاد کراتے رہے۔وہ چیخی چلائی تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہو گئی اور اسے یقین آ گیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں، پرکاش کور ہے۔اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی۔‘‘

رشیدہ لاچار تھی، بے بس تھی، درندوں کے چنگل میں تھی اس لئے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور تھی:

’’اس کے اندر کی رشیدہ اس سے گزرے ہوئے، بھوگے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی۔کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی کی بات ہو یا مغلیہ دور میں گوروگوبند سنگھ جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ، پاکستان کا مطلب لا الہٰ الا اللہ ہو یا پلیدستان۔۔۔وہ تو اپنا مطلب، اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی۔اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی۔اس نے اپنی بے معنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اس سمجھوتے نے بے معنویت سے ایک نئی معنویت پیدا کر دی۔دو گبھرو بیٹے اور ایک خوبصورت بیٹی۔۔۔لیکن وہ جب بھی اپنے ماحول سے مطمئن ہونے لگتی، اندر کی بے اطمینانی اور بڑھ جاتی۔اطمینان اور بے اطمینانی کی اسی حالت میں زندگی کو جھیلتے، بھوگتے وہ بڑھاپے کی منزل تک آ گئی‘‘

حیدر قریشی نے اس لرزہ خیز افسانہ میں دکھلایا ہے کہ وقت کس طرح خود کو دہراتا ہے اور تاریخ کس طرح کروٹ لے کر اصل رُخ دکھلاتی ہے اور کینچلی بدل کر نیا رُوپ دھارن کرتی ہے۔’’شناخت‘‘ میں ایک نیا دھماکہ ہوتا ہے اور اندرا گاندھی قتل کر دی جاتی ہیں۔چونکہ ان کا قتل ایک سکھ نے کیا تھا اس لئے اس کا ردِعمل ہوتا ہے اور انتہا پسند ہندوؤں کو کھل کھیلنے کا موقعہ ملتا ہے۔سکھوں کا قتلِ عام شروع ہو جاتا ہے کبھی کا سکھ لیڈر سریندر سنگھ سرکاری حفاظتی کیمپوں میں رہائش کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا کہ بلوائیوں نے اس کے گھر کی دہلیز پر اس کے دونوں جوان بیٹوں کو قتل کر دیا اور گھر کو آگ لگا دی۔رشیدہ یا پرکاش کور اپنی جوان بیٹی کے ساتھ گھر کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند گئی مگر بقول حیدر قریشی: ’’اس کے سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔چترا ایک مکان

کے کمرے میں مقید تھی اور وہ برآمدے میں بے بس بندھی کھڑی تھی۔آٹھوں بدمعاش اس کی بیٹی کو باری باری ریپ کررہے تھے۔۔۔۔''

یہاں عورت ہونے یالڑکی ہونے کی لاچاری کوافسانہ نگارحیدرقریشی نے سوالیہ نشان کے طور پر بیان کیا ہے اورآخر میں یہ رائے قائم کی ہے

کہ:''وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ایک عورت ہے۔یہی اس کا نام ہے یہی اس کا مذہب ہے''

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور ارتقائی تبدیلی سے دوچار ہوتی ہے۔اس کی مثال حیدرقریشی کا افسانہ''۲۷۵۰ سال بعد'' ہے۔اندرونی تضاد کی بنیاد خارجی اثرات کی مدد سے کوئی بھی شے تبدیلی سے دوچار ہوتی ہے۔شروع شروع میں تبدیلی مقداری ہوتی ہے۔لیکن بعد میں بہت زیادہ مقداری تبدیلی واقع ہوجانے کے بعد ایک جست کے ذریعے اشیاء ایک کیفیتی تبدیلی سے دوچار ہوتی ہیں۔تاریخ مادی حالات کے ارتقا کے شانہ بشانہ سبب اور نتیجے کے رشتے سے جنم لینے والے قابلِ فہم اور مربوط حالات کا ارتقاء ہے۔تاریخ اتفاقات سے جنم نہیں لیتی۔تاریخ سازش سے نہیں بنتی۔یہ اندرونی مادی حقائق کی جائز تخلیق ہوتی ہے۔ایک مرحلے پرآکر اس میں کیفیتی تبدیلی آجاتی ہے اور انسانی ارتقاء کا ایک عہد ہمیشہ کے لئے گزرجاتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ چیزوں کا اور حالات کا جوہر بدل جاتا ہے۔قدیم ترین انسانی سماج اور موجودہ زمانے میں فرق صرف یہ نہیں کہ سائنس کی ترقی ہوگئی ہے۔عظیم الشان عمارات بن گئی ہیں اور مشینیں کام کررہی ہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان بھی تبدیل ہوگیا ہے۔انسانی سماج کا جوہر تبدیل ہوگیا ہے۔سماجی نظام بدل گیا ہے اور انسانی رشتے اور شرفِ انسانی بھی ایک کیفیتی فرق سے دوچار ہوکر تبدیل ہوچکا ہے:

''میں وہ اوڈیسس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں۔اس لئے مجھے ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے۔ہومر کے برعکس میری پریشانی یہ ہے کہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں اور مجھے کسی بادشاہ سے انعام واکرام بھی نہیں لینا ہے۔آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔مجھے ابھی یہ عذاب جھیلنا ہے، پھر اسے رقم کرنا ہے۔مجھے اندازہ ہے کہ اس کے بعد ایک قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اسی قیامت میں کوئی طوفانی لہر یا شدید تھپیڑا مجھے اتھاکا پہنچادے گا، جہاں میرے عوام کے علاوہ میری پینی لوپی بھی شدت سے میرا انتظار کررہی ہے۔''

سماج میں تبدیلی لازمی ہے۔اس کی وجہ اس کے اندر کارفرما تضادات ہیں۔ان تضادات کا ارتقاء اسے ایسے مرحلے پرلے آتا ہے جب تبدیلی لازمی ہوجاتی ہے۔یہ تاریخی ضرورت ہوتی ہے۔سماجی قوانین کا اظہار عوام کے عمل میں ہوتا ہے اور عوام اپنے عمل سے تاریخ کو تبدیل کرتے ہیں۔

زندگی کے ہر شعبہ کی مانند کردار کے بحران کو بھی حیدرقریشی نے چابکدستی سے افسانہ''انکل انیس'' میں بیان کیا ہے:

''میں جنس کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتا ہوں۔معاشرتی حدود میں رہ کر اس کے تقاضے پورے ہوں تو زیادہ بہتر ہے لیکن اگر کوئی ان سماجی حدود کو باہمی رضامندی اور خاموشی سے پھلانگتا ہے تو میں اس پر بھی خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ہر کسی کی اپنی زندگی ہے کوئی جیسے چاہے بسر کرے۔میں دو دن لاہور رہا۔اس دوران میں انکل انیس سے دوملاقاتیں ہوئیں۔میں نے مسز توصیف یا انکل انیس کو ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ مجھے ان کے ناجائز مراسم کا علم ہوگیا ہے۔''

اس افسانہ میں حیدرقریشی نے ایک روشن اور اثبات گزار اشاریہ یوں دیا ہے:

''آپ ناراض ہو ہی گئے ہیں تو جاتے جاتے یہ کڑوا سچ بھی سن لیجئے کہ خواتین کے لئے اتنے حقوق مانگئے جتنے آپ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کو دے سکیں۔کیا آپ اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کو یہ حق دیں گے کہ وہ کسی اور انیس صاحب کے ساتھ اسی طرح دورے کریں۔''

مکھی کی نفسیات سے جنسی عمل تک پہنچنے کے مرحلے کو حیدرقریشی نے افسانہ''اعتراف'' میں بیان کیا ہے۔حقیقت آگہی وحقیقت نگاری کے تجزیاتی عمل کو انہوں نے کرداروں کے اوپر اس طرح آزمایا ہے اور سماج کے انتہائی بے آواز استحصال کی حقیقت کو سمجھنے کی ایسی صورت پیدا کی ہے کہ دانش وری ان کی پہچان بن گئی ہے۔

''مجھے اپنی ساری زندگی میں صرف دو دفعہ شدید پچھتاوا ہوا ہے۔ایک دفعہ تب ہوا جب میرے بچپن کے دوست اور لندن میں مقیم شاعر کی میم بیوی میرے پیچھے پڑ گئی۔اس نے مجھے صاف صاف بتادیا کہ تمہارا دوست جنسی لحاظ سے ناکارہ ہوگیا ہے اور اب نوجوان لڑکوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا objective گزارا کررہا ہے۔اُس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے دوست کا لحاظ مار گیا۔میں نے اپنی جھولی میں خود بخود آکر گرنے والے پھل کو اُٹھا کر اپنے دوست کی فرج میں رکھ دیا۔اپنی اس شرافت پر میں آج بھی شرمندہ ہوں۔مجھے اس میم کو مایوس نہیں کرنا چاہئے تھا۔دوسری دفعہ مجھے اس وقت پچھتاوا ہوا جب لاہور کی ایک بُری عورت کی خواہش میں نے پوری کردی۔مجھے اس عورت کی صورت کسی مکھی کی طرح لگنے لگی ہے اور اسی لئے میرے پچھتاوے میں کراہت بھی بڑھتی جارہی ہے۔میں نے یہ باتیں بھی اپنی بیوی کو بتادی تھیں۔''

کسی بھی نوعیت کے مادی تجربہ کی تقلیب جب تخیلی تجربہ میں ہوتی ہے تو وہ فنی تجربہ میں منقلب ہوتا ہے۔حیدرقریشی نے اسلامی متھ کا سہارا لے کر بعض اسرار ورموز کی واشگافی کی کوشش کی ہے۔افسانہ''بھید'' میں اللہ والی جنت بی بی کے خواب کا واقعہ ہے۔حضرت ابوعبداللہ جلاؒ اور حضرت حسن بصریؒ جیسے بزرگوں کے روحانی تجربات کا واقعہ ہے

اورخود پر منکشف ہونے والی واردات کا بھی ذکر ہے:

''تب میں شوگرملز میں ملازم تھا۔دسمبر کے آخری دن تھے۔اُس شام کو میری چھ بجے سے رات دو بجے تک والی شفٹ تھی۔جب میں ڈیوٹی کے لئے جارہا تھا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔میں نے لیبارٹری میں بہ مشکل دو گھنٹے کام کیا تھا کہ بخار تیز ہوگیا۔اپنے معاون کو اپنی ڈیوٹی سونپ کر میں لیبارٹری کے متروک ڈارک روم میں چلا گیا۔وہاں فلٹر کلاتھ کا صرف ایک ٹکڑا پڑا تھا' جسے میں نے بچھونا بنالیا' سرہانے ایک اینٹ رکھی اور سکڑ کر لیٹ گیا۔جیسے جیسے بخار چڑھ رہا تھا ٹھنڈک کا احساس بڑھ رہا تھا۔اوپر کوئی رضائی' کمبل یا چادر نہ ہونے کے باعث کپکپی ہونے لگی تھی۔اچانک ایسے لگا جیسے کسی نے آ کر میرے اوپر رضائی ڈال دی ہو اور پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔رات ڈیڑھ بجے جب چھٹی کا پہلا سائرن بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔میرا جسم پسینے سے بھرا ہوا تھا۔بخار ٹوٹ چکا تھا۔میں نے اپنے اوپر پڑی ہوئی رضائی کو ایک طرف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔مگر یہ کیا؟ ڈارک روم میں کسی رضائی کا نام و نشان نہ تھا۔یہ کیا بھید تھا؟۔۔۔۔۔۔۔پہلے تجربے کے پورے بیس سال بعد کل رات پھر ایک انوکھی واردات ہوگئی ہے۔۔۔۔''

اسلامی اساطیر کے ہی سلسلے کا ایک افسانہ ''بابا جمالی شاہ کا جلال'' ہے۔صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے حالات اور مجذوبوں' فقیروں کی روحانی قوت کے کئی واقعات اس افسانہ میں ہیں۔ایک مجذوب کا قصہ ملاحظہ کیجئے:

''مغلیہ دور میں جب ایک اہم مغل بادشاہ کی تیار کرائی ہوئی عالی شان مسجد میں پہلی نماز ہونے لگی تو ایک مجذوب بھی نماز کے مقتدیوں میں شامل ہوگیا۔مغلوں کے مقرر کردہ امام نے نماز شروع کی تو اُس مجذوب نے بلند آواز سے کہا: 'جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے'

مغل بادشاہ' اُن کے سرکاری امام اور سارے درباریوں کو مجذوب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔نماز کے بعد اس مجذوب کو ڈانٹا گیا تو اس نے بڑی سادگی سے کہا: میرے قدموں کے نیچے کی زمین کھود کر دیکھ لو۔میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔بادشاہ کے حکم سے اُسی وقت وہاں کی کھدائی کی گئی تو ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔سب لوگ اس واقعہ پر ابھی حیران ہی تھے کہ اس مجذوب نے کہا: نماز شروع کرتے ہی امام نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاہی مسجد کی پہلی نماز پڑھا رہا ہوں۔ظلِ الٰہی بہ نفس نفیس حاضر ہیں۔کم سے کم سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تو ضرور انعام میں عطا کریں گے۔۔۔۔اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔مجذوب نے یہ بات کہی اور یہ جا' وہ جا۔۔۔بادشاہ اور درباری حیران اور امام

صاحب شرمندہ و پریشان۔''

حیدر قریشی کو نفسیات پر بھی گرفت ہے۔افسانہ ''گھٹن کا احساس'' میں وجود کا باطن لحظہ لحظہ جذب ہوتا رہتا ہے اور سفاکیاں پہلو بدلتی رہتی ہیں' دَم گھٹنے اور شدید گھبراہٹ طاری ہونے کی کیفیت کو انہوں نے بڑی چابکدستی اور فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے:

''وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔اسے زمین سے جُڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بلندی اور پانی سے اس کا خوف بڑھتا گیا۔ایک بار وہ ایک بائیس منزلہ عمارت کی آخری منزل پر گیا۔بائیسویں منزل کے ایک فلیٹ کی بالکونی سے جب اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی نیچے گر پڑے گا۔اس نے بالکونی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ جُڑ کر آہستہ آہستہ کمرے کی طرف سرکنا شروع کیا اور جب وہ تین میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالکونی کے ساتھ ملحقہ کمرے میں گیا تو اس کا سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے وہ تین سو میٹر کی دوڑ کے آخری پوائنٹ پر پہنچا ہو۔''

اسی افسانہ سے ایک اور اقتباس دیکھئے:

''تنگ باتھ روم میں جا کر کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی ملنگ ہے جو کسی شہزادی پر فریفتہ ہوگیا ہے اور بادشاہ نے اسے سزا کے طور پر دیواروں میں زندہ چُن دینے کا حکم دے دیا ہے۔تب وہ نہائے بغیر ہی گھبرا کر باہر نکل آتا۔''

انسانی آشوب' فکری انتشار اور نئی جمالیات و نئی اخلاقیات کی جستجو کا شعور حیدر قریشی کے افسانہ ''مسکراہٹ کا عکس'' میں ملتا ہے۔اس افسانے کا کردار 'میں' تنظیم پرور، جمود سے نبرد آزما نظر آتا ہے اور موجودہ اچھائی اور برائی کے سیاق سے جُڑ کر صحیح تخلیقیت کی پرورش کرنا چاہتا ہے جو 'سچ' ہے اور جس سے اندر اور باہر کی دنیا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ساتھ ہی باپ سے بیٹے تک کی نصیحت کو آنے والی نسل میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور اپنے وجود کی تکمیلیت کو سمجھا جا سکتا ہے:

''ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی اباجی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ٹیپو اباجی کی گود میں تھا اور زلفی' شازی' اُن کے دائیں بائیں۔۔۔۔مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔میں تصویر میں موجود نہیں تھا۔لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی۔سو اس تصویر میں اپنی موجودگی' اپنی شرکت کا احساس جاگا۔اپنے تینوں بیٹوں اور اباجی کی تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہوگیا' مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی' حال اور مستقبل تینوں زمانے یکجا ہوگئے ہیں۔''

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں ان وسعتوں کی دریافت کی ہے جہاں سے قدروں کے سرچشمے قریب نظر آتے ہیں۔انسانی ذہن ہمہ وقت وجدان حاصل کرتا ہے۔اور یہ وجدان اُس وقت فن بنتا ہے جب فنکار کا ذہن اسے مکمل اظہار کی صورت بخشتا ہے۔حیدر قریشی اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے بیشتر مظاہر کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں۔اسی لئے ان کے یہاں زمینی خوشبو‘عصری تازگی‘ نئے تخلیقی رویہ اور برتاؤ کی توانائی ملتی ہے۔حیدر قریشی اپنے افسانوں میں نئے موضوعاتی پھیلاؤ کے ذائقوں‘رنگوں اور پہلوؤں کو سمونے کے فن سے بخوبی واقف ہیں!

حیدر قریشی بظاہر ادب کی کئی اصناف میں ایک طویل عرصے سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اسرار کی گتھیاں اُن پر باندازِ دگر کھولتی ہے.....اُن کا شمار ساتویں دہے کے اُن افسانہ نگاروں میں کرنا مناسب ہوگا جو تجریدیت سے معنی کا نیا مدار طلوع کرتے ہیں اور سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔**ڈاکٹر انور سدید**

(اقتباس از تبصرہ ’’روشنی کی بشارت‘‘ مطبوعہ ادبی جریدہ ’’اوراق‘‘ لاہور شمارہ: نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء)

حیدر قریشی نے کچھ افسانے تاریخ اسلام یا اسلامی روایات و حکایات سے اخذ کئے اور کچھ مغلیہ خاندان کی راکھ کرید کر بیان کئے ہیں۔۔۔۔سیاسی مسائل اور معاشرتی مسائل کو بھی عالم اسلام کے تناظر کے ساتھ مغربی اور ہندی تہذیبوں کی کہانیوں میں سمو دیا ہے۔جن میں مغرب زدگی اور ناموافق صورتحال میں متوقع نتائج کی حامل حکمت عملی سے عموماً ان افسانوں کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔۔۔۔حیدر قریشی کے افسانے معنی خیز نکتہ بیان کرتے ہیں جو مشاہدے اور تجربے کی دین ہے۔تاہم ان کا شاعر ہونا بھی ان کے افسانوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔پھر انہیں بیرون ملک جانے اور غیر ملکی ادیبوں اور ناقدوں سے بھی رابطے استوار کرنے کا موقعہ ملا جس کی وجہ سے انہیں اپنے بعض معاصر افسانہ نگاروں پر یہ تفوق حاصل ہوا کہ یہ کہنے کا ڈھنگ جانتے ہوئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ ذہنی و جذباتی واردات کے بیان میں بھی لفظوں کے نرخرے کٹنے نہیں دیتے۔۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ و تہذیب کے پُراسرار اور پیچیدہ جنگل میں اتر کر اظہار و ابلاغ کے وسیلے کو معتبر بناتے ہیں۔۔۔**محمد وسیم انجم**

(بحوالہ ’’حیدر قریشی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ‘‘ مطبوعہ ماہنامہ ’نیرنگِ خیال‘ راولپنڈی ستمبر ۱۹۹۸ء)

ادبی عدالت میں

دو کہانیوں میں حیرت انگیز توارد

سعید شباب (خان پور)

۱۹۸۰ء میں تین ماہ کے وقفے سے دو افسانہ نگاروں کے دو ایسے افسانے شائع ہوئے جو علامتی پیرایۂ اظہار کے باوجود اپنی کہانی اور ٹریٹ منٹ دونوں میں گہری مماثلت رکھتے تھے۔ پہلا افسانہ نوجوان افسانہ نگار حیدر قریشی کا "اپنی تجرید کے کشف کا عذاب""اوراق" ستمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا جبکہ دوسرا افسانہ رضیہ فصیح احمد کا "رنگ، کینوس اور نقاد"" تخلیقی ادب" کراچی دسمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں پاکستان سے دو اہم ادبی انتخاب شائع ہوئے ایک سرسیدین کا پاکستانی ادب نمبر رشید امجد جیسے نامور ادیب نے مرتب کیا۔ دوسرا انتخاب "۱۹۸۰ء کے بہترین افسانے" جسے فرحت نواز اور غزالہ طلعت نے مرتب کیا۔ رشید امجد کے انتخاب میں رضیہ فصیح احمد کے معروف نام کے پیشِ نظر ان کا مذکورہ بالا افسانہ "رنگ، کینوس اور نقاد" شامل کیا گیا جبکہ حیدر قریشی کا افسانہ شامل نہیں کیا گیا۔فرحت نواز کے انتخاب میں دونوں افسانے شامل کئے گئے اور فرحت نواز نے "پیش لفظ" میں ان دو افسانوں کے حوالے سے لکھا۔ "حیدر قریشی نے ایک مصور کا روگ اس پیرائے میں بیان کیا ہے جو پورے معاشرے کا روگ بن کر سامنے آتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے "رنگ، کینوس اور نقاد" میں بھی اس مصور کا روگ قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ "اپنی تجرید کے کشف کا عذاب" (مطبوعہ "اوراق" ستمبر ۱۹۸۰ء) اور "رنگ، کینوس اور نقاد" (مطبوعہ تخلیقی ادب دسمبر ۱۹۸۰ء) میں حیرت انگیز اتفاقی مماثلت کے باوجود ٹریٹ منٹ کا تھوڑا فرق ہے"۔ (پیش لفظ ’’۱۹۸۰ء کے بہترین افسانے‘‘)

اصل حقیقت یہ ہے کہ فرحت نواز نے ٹریٹ منٹ کا فرق کہہ کر صرف رضیہ فصیح احمد کے ساتھ رعایت کی ہے ورنہ دونوں کہانیوں کی ٹریٹ منٹ بھی تقریباً ایک جیسی ہے۔اس انتخاب کی اشاعت کے باوجود پاکستانی اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں تک میں بھی اس توارد کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔اس دوران حیدر قریشی نے رضیہ فصیح احمد کو ایک خط لکھ کر

اس "اتفاقی مماثلت" کی طرف توجہ دلائی اوراس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم چھوٹے شہروں کے چھوٹے ادیب بھی آپ جیسا ہی سوچ اور محسوس کر رہے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد نے (اپنے خطوط مطبوعہ "تخلیق" لاہور کے مطابق) تسلیم کیا ہے کہ انہیں حیدر قریشی کا خط انہیں دنوں مل گیا تھا۔ رضیہ فصیح احمد کی وضاحت اور حیدر قریشی کا موقف بعد میں---- پہلے توارد کی اس کہانی کا تسلسل قائم کر لیا جائے۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء کے "نگار" (مدیر ڈاکٹر فرمان فتح پوری) میں حیدر قریشی کا ایک طویل مضمون "موجودہ علامتی ادب" کے عنوان سے شائع ہوا اس میں حیدر قریشی نے رضیہ فصیح احمد کے بیانیہ سے جدید علامتی افسانے کی طرف آمد کا خیر مقدم کیا۔ حاشیے میں انہوں نے "رنگ، کینوس اور نقاد" اور "اپنی تجرید کے کشف کا عذاب" دونوں کہانیوں کی مماثلت کی تفصیل بھی بیان کی----

رضیہ فصیح احمد کراچی میں مقیم ہیں اور نگار بھی کراچی ہی سے شائع ہوتا ہے بعد ازاں ماہنامہ "تخلیق" لاہور نے اپنا ضخیم کہانی نمبر شائع کیا تو اس میں ستار طاہر نے اپنے "فٹ نوٹس" میں پہلی دفعہ تنقیدی لب و لہجے کے ساتھ دونوں کہانیوں کے توارد کا ذکر کر کے رضیہ فصیح احمد سے وضاحت چاہی۔ چنانچہ "تخلیق" کے اگلے شمارے میں رضیہ فصیح احمد نے یوں وضاحت کی۔

"یہ افسانہ ۱۹۷۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اور ۱۹۸۰ء کے ابتدائی مہینوں میں مشفق خواجہ صاحب کو "تخلیقی ادب" کے لئے دے دیا تھا۔ غالباً کسی ذاتی مجلس میں پڑھا بھی گیا تھا۔ ان کے پاس ایک عرصہ تک رہا اور "تخلیقی ادب" کے دسمبر کے شمارے میں شائع ہوا جو نومبر میں بازار میں آ گیا تھا۔ حیدر قریشی صاحب کا ایک خط اس سلسلے میں مجھے ملا تھا اسی زمانے میں مشفق خواجہ صاحب نے بھی اس بات کا تذکرہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ خواجہ صاحب کی وضاحت سے افسانہ نگار صاحب کی تشفی ہو گئی۔ اسلام آباد کی ادبی کانفرنس میں بھی کسی نے غالباً مصنف نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا اور میں نے وہاں بھی وضاحت کر دی تھی۔ میرا یہ افسانہ ایک ذاتی تجربے اور اس سے متعلق چند خیالات پر مبنی تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر حیدر قریشی صاحب اپنے افسانے کی ایک کاپی مجھے بھی ارسال کریں۔ میں بھی دیکھنا چاہوں گی کہ حیرت انگیز مماثلت تھیم میں ہے یا ٹریٹ منٹ میں"

(ماہنامہ "تخلیق" لاہور شمارہ نمبر ۱۱،۱۱۱۲۔۱۹۸۴ء)

اس وضاحت کے بعد حیدر قریشی نے "تخلیق" میں اپنا خط شائع کرایا جس میں کراچی میں دسمبر ۱۹۸۴ء میں جمیل زبیری کے ہاں حیدر قریشی اور رضیہ فصیح احمد کے درمیان ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کا ذکر ہے۔ اس سے اگلے روز ایک ادبی فنکشن تھا جس میں رضیہ فصیح احمد نے آنے کا وعدہ کیا اور حیدر قریشی نے وعدہ کیا کہ وہ اپنا افسانہ اسی فنکشن میں انہیں فراہم کر دیں گے۔ لیکن وعدہ کے باوجود (غالباً کسی مجبوری کے باعث) رضیہ فصیح احمد اس فنکشن میں نہ

آ سکیں۔

حیدر قریشی نے یہ بھی وضاحت کی کہ تخلیقی ادب دسمبر ۱۹۸۰ء میں چھپ کر نومبر ۱۹۸۰ء میں نہیں بلکہ جنوری ۱۹۸۱ء میں مارکیٹ میں آیا۔ ثبوت کے طور پر اخبارات میں "تخلیقی ادب" کی اشاعت کی خبروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اہل قلم کانفرنس ۱۹۸۱ء میں حیدر قریشی نے شرکت نہیں کی تھی لہٰذا ظاہر ہے ان کی رضیہ فصیح احمد سے اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی ممکن ہے کسی اور ادیب نے اپنے طور پر بات کی ہو۔ آخر میں حیدر قریشی نے لکھا کہ میرے پاس رضیہ فصیح احمد کا ایڈریس نہیں ہے وہ بتائیں کہ انہیں افسانہ کیسے بھجواؤں کیا جمیل زبیری کی معرفت بھجوا دوں؟ اس کے بعد رضیہ فصیح احمد نے جمیل زبیری کے توسط سے بھی افسانہ منگوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ چار سال پیشتر حیدر قریشی نے رضیہ فصیح احمد کو جو اولین خط لکھا اس سے لے کر تخلیق ۱۹۸۵ء کے پہلے شمارے تک کسی خط میں بھی سرقہ کا الزام نہیں لگایا بلکہ یہی کہا کہ مماثلت یقیناً اتفاقی ہوگی لیکن اگر میرا افسانہ بعد میں شائع ہوتا تو اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں نے مجھے جینے نہیں دینا تھا۔ مجھ پر سرقہ کا الزام لازماً لگایا جاتا اور یہ سارا شور وہی اخبارات مچاتے جنہیں ابھی تک اس معاملے پر دو سطریں چھاپنے کی توفیق نہیں ملی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کو جب اس توارد کی خبر ملی تو انہوں نے حیدر قریشی کے نام اپنے خط میں لکھا کہ رضیہ فصیح احمد کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اگر کوئی ایسی بات ہے تو اسے سامنے آنا چاہیے۔ جب میں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ خط پڑھا تو ضروری محسوس ہوا کہ ان دونوں کہانیوں اور ان کی پس پردہ کہانی کو قارئین ادب کے سامنے پیش کر دوں، پاکستان میں معاصرین کو فیصلہ کرنے سے پہلے سو مصلحتیں اور مجبوریاں درپیش ہو سکتی ہیں اسی لئے یہ سارا کیس دو ماہی "گلبن" احمد آباد کے توسط سے اردو ادب کے قارئین کی عدالت میں پیش ہے۔

دونوں کہانیوں کا خلاصہ

دونوں کہانیوں میں ایک مصور کا روگ بیان کیا گیا ہے۔ حیدر قریشی کی کہانی میں مصور کو ایک کشف ہوتا ہے اور وہ اس کشف سے دنیا کو آگاہ کرنے کے لئے تصویر پر اس کشف کو اتارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن رنگ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ رضیہ فصیح احمد کی کہانی میں مصور کی بینائی زائل ہونے لگتی ہے اور اسے اپنی نمائش کی تصویریں بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ رنگ اس کا بھی ساتھ نہیں دیتے دونوں کہانیوں میں مصور رنگوں کے عدم تعاون کے بحران سے الجھ کر تنگ آ جاتا ہے اور دونوں ہی کہانیوں میں جھلا کر سارے رنگوں کو گھول کر کینوس پر تھوپنا اور ملنا شروع کر دیتا ہے۔ جب جھلاہٹ یا جنون کی حالت ختم ہوتی ہے تو دونوں کہانیوں کے مصوروں نے اپنی زندگی کے شاہکار بنا لئے

ہوتے ہیں۔رضیہ فصیح احمد کی کہانی میں تیس تصویروں سے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے تیس سال لئے گئے ہیں اور یوں ان کی کہانی ایک لحاظ سے پیپلز پارٹی کی ترجمانی کرتی ہے جبکہ حیدر قریشی نے کسی خاص طبقے کو اہمیت دینے کی بجائے قومی روگ کی تشخیص کی ہے اور اپنے سمیت ساری قوم کو اس کا مجرم قرار دیا ہے۔

ستار طاہر کے تاثرات

حیدر قریشی نے ایک خط کے ذریعے میری توجہ دو افسانوں کی طرف مبذول کرائی۔حیدر قریشی کا افسانہ ''اپنی تجرید کے کشف کا عذاب'' 'اوراق' (ستمبر ۸۰) میں شائع ہوا۔رضیہ فصیح احمد کا افسانہ ''رنگ، کینوس اور نقاد'' 'تخلیقی ادب' کے پہلے شمارے (دسمبر ۸۰) میں شائع ہوا۔میں نے ان دونوں افسانوں کا بغور مطالعہ کیا۔اس میں کچھ شک نہیں کہ پہلے شائع ہونے والے حیدر قریشی کے افسانے اور بعد میں شائع ہونیوالے رضیہ فصیح احمد کے افسانے میں حیرت انگیز مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔حیدر قریشی نے مجھے لکھا کہ اس مماثلت اور ''اتفاق'' کے حوالے سے انھوں نے رضیہ فصیح احمد کو خط بھی لکھا جس کا جواب انھیں نہیں ملا۔حیدر قریشی کہتے ہیں کہ اگر ان کا افسانہ رضیہ فصیح احمد کے افسانے کے بعد شائع ہوتا تو نقاد حضرات ان کو سرقے کا مرتکب قرار دیتے،لیکن رضیہ فصیح احمد کے معاملے میں خاموش ہیں۔ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان افسانوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ چونکہ حیدر قریشی کا افسانہ پہلے شائع ہوا،اس لئے رضیہ فصیح احمد کی طرف سے اس کی وضاحت ہونی چاہئے۔

(ستار طاہر۔''فٹ نوٹس''مطبوعہ ماہنامہ تخلیق لاہور'' کہانی نمبر ۱۹۸۴ء)

یورپ میں مقیم اردو قلمکاروں کی فہرست میں حیدر قریشی صاحب کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ویسے تو انہوں نے مختلف اصناف ادب میں اپنی محنت وریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت ہی قابلِ لحاظ ہیں۔بعض بالکل ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ان کا ایک بالکل ہی علاحدہ اور نا قابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے،جس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی کوششیں اور تخلیقات آج نہیں تو کل (نئی صدی میں) ضرور اپنی آب وتاب کے پیمانے پر ایک نئے دبستانِ ادب وتحریر کی ہمنوائی کا شرف حاصل کریں گی۔**قیصر تمکین**

(حیدر قریشی کے مجموعہ ''افسانے'' پر آرٹیکل مطبوعہ ویکلی راوی بریڈفورڈ۔انگلینڈ)

میری محبتیں

جوگندر پال (دہلی)

حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لئے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے اور یوں وہ مطالعہ کو بے تامل اپنی مرضی اور خواہش سے گھٹاتے بڑھاتے گویا اس کے بارے میں پڑھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنے معمول کے دوران اس سے عین مین مل کر اپنے نتائج اخذ کر رہا ہوتا ہے۔حیدر قریشی کی اس خوبی نے اس کے خاکوں کو واقعی بہت جاندار اور قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔

حیدر قریشی کی اس کتاب کے بیس خاکے دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔پہلے دس کے لئے تو وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہی تاکا کیا ہے اور باقی دس کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہے۔اوّل خویش،بعد درویش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گھر والوں کے تو کلوز اپ تیار ہو گئے ہیں اور درویشوں کے پروفائل،اور ہر دو پر سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔

آج کے مشینی دور کی مصروفیت میں سچ مچ کی ملاقاتوں کی گنجائش خطرناک حد تک سکڑتی جا رہی ہے۔ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ اوروں کے خاکے پڑھ پڑھ کر ہی ہماری ان سے ملنے کی چاہ پوری ہوتی رہے۔یوں نہیں تو یونہی سہی،جیسے بھی انسان اپنے آپ کو ''انسانیا'' لے۔مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کی محبتوں کی یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی!

(حیدر قریشی کے خاکوں کے مجموعہ ''میری محبتیں'' کے فلیپ پر درج رائے)

حیدرقریشی اور میری محبتیں

خاور اعجاز (راولپنڈی)

خاکہ لکھنا ایک مشکل بلکہ نہایت مشکل فن ہے۔ خاکہ نگار حضرات جانتے ہیں کہ ایک اچھا خاکہ تخلیق کرتے ہوئے اُنہیں کس پُل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں عمدہ خاکہ نگاروں کی فہرست میں گنتی کے چند نام ہی شامل ہیں اور میری ذاتی رائے میں یہ گنتی بھی Double Figure کو چُھوتے ہوئے شرما جاتی ہے۔ بہت سے ایسے حضرات جن میں عمدہ خاکہ نگاری کی خصوصیات موجود نہیں، اُنہوں نے پُل صراط سے گزرنے کی بجائے کشتیوں کو جوڑ کر ایک ہنگامی پُل بنایا اور گزر گئے۔ بعض نہیں بھی گزر سکے اور کسی کشتی کے ڈوب جانے کے سبب آدھے راستے سے واپس ہو گئے۔ حیدر قریشی نے اپنی کتاب میں شامل مضامین کو خاکے ضرور کہا ہے لیکن اُن کے ساتھ لفظ 'یادیں' بریکٹ کر کے اپنی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیا ہے۔ دُوسرے اُنہوں نے کتاب کا نام 'میری محبتیں' رکھ کر خاکے کے مضر پہلوؤں سے بھی دامن محفوظ کر لیا ہے۔

حیدر قریشی بے تکان لکھنے والا شخص ہے جس نے اُردو ادب کی بہت سی اصناف میں اپنا اظہار کیا ہے۔ خاکے کی حدوں کو چُھوتی ہوئی محبتوں کی مختلف شکلیں ہمیں اُن کی زیرِ نظر کتاب میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ غیر روایتی انداز، برجستگی اور لطافت کم و بیش سبھی تحریروں میں موجود ہے۔ دو حصوں پر مشتمل کتاب کا پہلا حصہ جسے اُنہوں نے 'اوّل خویش' کا نام دیا ہے، عزیزوں اور رشتہ داروں کے بارے میں ہے اور دوسرا حصّہ جو 'بعد درویش' کے تحت ہے، ادبی اور بعض دوسرے بزرگوں اور دوستوں کے حوالے سے ہے۔ ہر مطالعہ کے عنوان کو زیرِ بحث شخصیّت کی کسی نمایاں خوبی سے متّصف کرنے کے علاوہ ایک موزوں شعر کے وسیلے سے واضح بھی کیا ہے اور مضبوط بھی۔ مجھے اُن کی یہ تینوں جدّتیں اچھی لگی ہیں۔

پہلے حصّے کے مطالعوں میں ایک بے تکلّفی اور قربت کے احساس کے علاوہ ایک جذباتی وابستگی پائی جاتی ہے جو قرابت داریوں میں ہوتی ہے۔ یہاں بعض مقامات پر عموماً اور اپنی والدہ ماجدہ کے بارے میں لکھتے ہوئے خصوصاً وہ ایک ایسی جذباتی سطح کو مس کرتے ہیں جہاں قاری کی آنکھیں بھی بھیگنے لگتی ہیں۔ گویا اُنہوں نے یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیا کہ وہ کسی ذاتی وابستگی کا ذکر کر رہے ہیں بلکہ قاری اسے اپنی ہی واردات سمجھنے لگتا ہے۔ یہ

صفت جہاں تحریر کو مطالعاتی سطح پر غیر مبہم بناتی ہے وہاں احساساتی سطح پر بھی اپنے ہالے میں لیتی ہے۔ دوسرے حصّے کے مطالعے زیادہ تر ادبی شخصیّتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ہمیں حصّہ اوّل جیسی بے تکلّفی تو نہیں ملتی لیکن اس کی جگہ حیدر قریشی کے ذہن کی دوسری زرخیزیوں سے ضرور ملاقات ہوتی ہے جو میرزا ادیب کی عمر اوڑھ کر نوجوان ادیبہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی خواہش یا ننگ دھڑنگ پیر بابا کی فرنٹ سیٹ پر موجودگی سے اعجاز اکبر صاحب کا ہاتھ گیئر کی بجائے کہیں اور جا پڑنے کی تشویش میں ظاہر ہوتی ہے۔

حیدر قریشی کی یہ تحریریں محبت کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں ہلکا سا طنز یا مزاح کا پہلو لئے ہوئے کوئی چبھتی ہوئی بات بھی محبت ہی کا ایک اظہار ہے۔ اوّل تو حیدر قریشی کی محبت بھری نظریں اپنے ممدوحین کی ذات میں کوئی خامی دیکھتی ہی نہیں اور اگر نظر آ بھی جائے تو وہ اُسے اپنے محبت بھرے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ بھی خوبی ہی دکھائی دینے لگتی ہے۔ بعض تحریریں جلد اختتام پذیر ہو گئیں ہیں یا شاید ہم اُن کرداروں کے متعلق پڑھتے ہوئے اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ ابھی متعلقہ کردار کے ساتھ ہماری جان پہچان کی کچھ ہی منزلیں طے ہوئی ہوتی ہیں کہ تحریر کے جلد ختم ہو جانے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اسے خاکہ نگاری کی کسی Shortcomming پر محمول نہ کیا جائے بلکہ یہ تو ایک اچھّائی شمار ہونا چاہیئے کہ قاری اُس کردار سے ملاقات کی بے جا طوالت سے گھبرا کر جان چھڑانے کے چکّر میں نہیں پڑتا اور خاکہ ایک مناسب موڑ پر از خود ہی خدا حافظ کہہ دیتا ہے۔ تاہم مجھے یہ کہنے کی اجازت ضرور دیجئے کہ حیدر قریشی میں کرداروں کو اس سے بہتر طور پر متعارف کرانے کی صلاحیّت موجود ہے اور امیّد ہے کہ وہ اپنے اس جوہر کو مذکورہ کتاب تک ہی محدود نہیں رکھیں گے بلکہ اپنے دائرہ ٔتعارف میں آنے والے اور احباب سے ملاقاتوں کا اہتمام بھی کرتے رہیں گے۔

''میری محبتیں'' کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہو جاؤں گی۔ آپ کی تحریر میں بلا کی سادگی اور قاری کو باندھ رکھنے کی طاقت ہے۔ درد کی پوشیدہ لہریں دل و دماغ میں اندر تک اتر جاتی ہیں اور قاری اپنے آپ کو قاری نہ سمجھ کر حیدر قریشی بن جاتا ہے۔ یہ آپ کی تحریر کا کمال ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔**ڈاکٹر رضیہ حامد**

''میری محبتیں'' تو کمال کی کتاب ہے سیدھی، سنجیدہ باتیں لکھتے ہوئے آپ جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قہوہ پیتے پیتے الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آ کر ذہن و دہن کو خوشبو سے معطر کر جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔**ترنّم ریاض**

(اقتباسات خطوط بحوالہ ماہانہ ادبی خبرنامہ ''اردو دنیا'' جرمنی شمارہ: فروری ۲۰۰۰ء)

میری محبتیں

طاہر مجید (جرمنی)

پورٹریٹ کسی شخص کا ایک ایسا تخلیقی عکس ہوتا ہے جو حقیقی عکس کے قریب دکھائی دیتا ہے وہ پنسل سے بنایا جائے یا برش اور رنگوں سے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے دیکھتے ہی پہچان جاتا ہے کہ وہ کس شخص کا پورٹریٹ ہے۔ فنِ مصوری دوسرے فنون کی نسبت کچھ زیادہ ہی نزاکتوں سے متعلق ہے کیونکہ مصور کی ایک ہلکی سی پنسل یا برش نہ صرف اس تصویر کے خدوخال کو بدل کر رکھ دیتے ہیں بلکہ ایک عمومی تاثر بھی بعض اوقات اس سے یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی مصوری جب کوئی ادیب پنسل کی بجائے قلم کی نوک سے نکلے ہوئے لفظوں کے ذریعہ کرتا ہے تو میں اسے خاکہ نگاری کا نام دیتا ہوں جس طرح ایک پینٹنگ تو کوئی عام آدمی بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن پورٹریٹ وہی مصور بنا سکتا ہے جو اس فن سے واقف ہو، اسی طرح خاکہ نگاری کے لئے بھی فن سے واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ خاکہ نگاری میں بھی بعض اوقات ایک آدھ غلط اور تنگ و ترش لفظ لکھ دینے سے اس شخص کے متعلق قاری کی عمومی رائے متاثر ہو سکتی ہے۔

حیدر قریشی نے لفظوں سے بیس مختلف پورٹریٹ بنائے ہیں۔ ان میں نصف کا تعلق جسمانی رشتوں سے ہے اور باقی نصف کا معاملہ اس کے روحانی رشتوں تک جا پہنچتا ہے۔ روحانی رشتوں سے میری مراد ان شاعروں، ادیبوں اور ایسے لوگوں سے ہے جو کسی نہ کسی طور اس کی روح سے سابقہ رکھتے ہیں مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے ان خاکوں اور یادوں میں اس توازن کو برقرار رکھا ہے جو اس کی محبتوں کا حسن ہے۔

حیدر قریشی کے ان خاکوں کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گیا ہو جہاں دالان میں اس نے ایک بڑے تخت پوش پر گاؤ تکیئے سجا کر اپنے والد اور والدہ کو بٹھا رکھا ہے وہ سب سے پہلے میرا تعارف اپنے والد سے کرواتا ہے پھر والدہ سے، ساتھ ہی اس کے دادا اور نانا لیٹے ہوئے ہیں کچھ فاصلے پر اس کے تایا اپنی ہی دھن میں مگن بیٹھے ہوئے ہیں۔ تخت پوش کے ایک کونے پر اس کے ماموں بیٹھے ہیں اور اس کی والدہ اور ماموں کے درمیان اس کی آپی بیٹھی والدہ کے پاؤں داب رہی ہے جب کہ اس کے والد کے قریب ہی اس کا چہیتا بھائی

طاہر زمین پر بیٹھا اپنے والد سے رازداری سے کوئی بات کر رہا ہے۔ سامنے زمین پر کپڑا بچھائے اس کے پانچوں بچے کھیل رہے ہیں اس کے دو بھائی حیدر اور اس کے مہمانوں کے خلاف کوئی سازش پکی کرنے کچھ ہی دیر پہلے گھر سے باہر نکلے ہیں اور اس کی بیوی انہی کے خلاف بڑبڑاتی ہوئی ہمیں دیکھ کر مروتاً مسکرا رہی ہے۔

اس کے خاندان والوں کے تعارف سے فارغ ہوئے تو وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا میں حیران ہوا کہ ان میں سے بعض کو میں جانتا تھا اور بعض مجھے جانتے تھے البتہ چند ایک میرے لئے اجنبی تھے وہاں میرزا ادیب، فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرا اصغر اور سعید شباب موجود تھے۔ ایک فوجی بریگیڈئر صاحب سول وردی میں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے طاہر احمد نے البتہ آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا یوں لگا جیسے وہ میرا ہمزاد ہے باقی کچھ رنگا رنگ قسم کے لوگ تھے جنہوں نے ان ادباء سے کچھ فاصلے پر اپنی ہی محفل سجا رکھی تھی۔ اس تعارف کے نتیجے میں مجھے سوچنا پڑا کہ آخر حیدر قریشی کا اصل مسئلہ کیا ہے اس نے یہ تمام خاکے آخر کیوں لکھے ہیں؟ مجھے لگا جیسے وہ محبت کا دیوانہ نہیں بلکہ محبت کا گھائل بھی ہے۔ محبت اسے مختلف روپ سجا کر ملتی ہے اس دیوانگی میں وہ محبت کی ان تمام کیفیتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ وہ محبتیں جو اسے سچی محبت کے روپ میں ملیں یا جو اسے نفرت کے دیوتا کی صورت میں ملیں کیونکہ میرے نزدیک محبت اور نفرت جذبہ تو ایک ہی ہے فرق تو اس کے منفی اور مثبت پہلو کا ہے محبت بھرپور اور سچی ہو تو انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف اس شخص یا چیز کا جس سے وہ محبت کرتا ہو بار بار تذکرہ کرتا ہے وہی اس کے دل و دماغ میں ہر وقت گھومتے ہیں، سوتے جاگتے محبت کے اس تلذذ سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

خلوت میرے نصیب میں اے دوست اب کہاں

ہر وقت تیرا ذکر ہے، ہر وقت تو ہی تو

کچھ ایسی ہی کیفیت حیدر قریشی کی ہے اس کی تمام بے چینی بس محبت کے اس تذکرہ سے ہی کم ہوتی اور اسے سکون عطا کرتی ہے۔ مثلاً وہ دوسرے خاکے میں لکھتا ہے۔

"میری پہلی محبت بھی امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں اس اول اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر درحقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں"۔

اس کے ساتھ ہی وہ اس کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اپنی بیوی سے میری گہری دوستی کی وجہ شاید یہی ہے کہ امی جی کی بھتیجی ہونے کے ساتھ امی جی سے کافی مشابہت بھی رکھتی ہے"۔

لیکن اس کے مقابل پر وہ خاندان کے تمام افراد کا تذکرہ کرتے ہوئے بات گھما پھرا کر اپنے والد پر لے آتا ہے یہاں تک کہ ذکر ڈاکٹر وزیر آغا کا ہو یا سعید شباب یا اس کے خانپور کے دوستوں کا وہ کہیں نہ کہیں اپنے والد کا ذکر ضرور کرتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے والد سے بے انتہا محبت تھی اور ہے اور شاید یہ ایسی لازوال محبت ہے جو وہ کسی طور بھی کھونا نہیں چاہتا یہی مرحلہ اس کے عرفان ذات کا ہے۔ایک اچھے خاکہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس شخصیت کا خاکہ لکھ رہا ہو اس کے متعلق اس کی ذاتی معلومات درست اور ایک حد تک مکمل ہوں۔عموماً خاکہ لکھتے وقت اکثر باتیں اپنی ذات کے حوالے سے لکھتے ہیں اگرچہ ایسا کرنا ضروری نہیں البتہ حیدر قریشی نے ہر خاکے میں اپنی ذات کے حوالے سے باتیں کی ہیں اس صورت میں قاری جہاں ان خاکوں کے ذریعے ان شخصیتوں سے متعارف ہوتا ہے وہاں بالواسطہ خاکہ نگار کی شخصیت جا بجا جھانکتی نظر آتی ہے بلکہ ایک عام قاری بھی اس کی مختلف حیثیتوں کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔حیثیتوں سے میری مراد اس کی معاشی صورتحال کو واضح کرنا نہیں بلکہ میری مراد ''سلگتے خواب'' دیکھنے والے شاعر حیدر قریشی سے ہے، ''روشنی کی بشارت'' دینے والے افسانہ نویس، ایک تنقید نگار اور انشائیہ نگار حیدر قریشی سے ہے لیکن اگر بر سبیل تذکرہ اس کے معاشی حالات کی بات بھی ہو تو اس نے اپنے انتہائی عسرت کے زمانے کو بھی چھپانے کے بجائے نہایت دیانتداری کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ یہی عسرت تو اس کا داغ محبت ہے اسے رنج ہے کہ وہ اپنے باپ کی وہ خدمت نہیں کر سکا جو وہ کرنا چاہتا تھا اسے احساس ہے کہ کس طرح اس کے والد نے کپڑے کی دوکان سے ٹیلر ماسٹر تک کا تکلیف دہ سفر طے کیا۔شاید حیدر قریشی جنت صرف اپنی ماں کے قدموں میں ہی ڈھونڈتا باپ کا تذکرہ وہ ایسے نہ کر سکتا۔

اصولاً مجھے صرف اس کے خاکوں کے حوالے سے بات کرنی چاہیے تھی لیکن ایک دوست کی حیثیت سے مجھے چونکہ اس کی شاعری، افسانوں، انشائیوں اور اب خاکوں سب میں ایک مشترکہ مسئلہ دکھائی دیا ہے اس لئے میں ان چاروں اصناف سے حوالہ دینا چاہوں گا۔میں نے دیکھا کہ شاعری ہو یا افسانہ، خاکہ نویسی ہو یا انشائیہ، وہ ہر رنگ میں ہر جگہ اپنے باپ کی محبت کا تذکرہ ضرور کرتا ہے مثلاً اس کا شعر ہے۔

ابھی تو قول اپنے باپ کا ہم نے نبھانا ہے
ابھی اپنے مقدر کا کڑا اَبن باس باقی ہے

وہ اپنے افسانے " آپ بیتی "میں لکھتا ہے۔

"میرے باپ نے آسمان کی سرخی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے ہوئے رائے دی تھی کہ دنیا پر

عنقریب بہت بڑی تباہی آنے والی ہے"۔

اس کے انشائیہ "وگ"میں مرکزی حیثیت اس نے اپنے والد کو دے رکھی ہے۔

اس کا پہلا خاکہ اس کی باپ سے محبت کا چوتھا ثبوت ہے۔

دراصل شاعری افسانہ نویسی اور انشائیہ نویسی کے بعد اس نے خاکہ نویسی کو اظہار محبت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں دو اور مثالیں پیش کروں گا۔حیدر کا شعر ہے۔

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

اگر آپ اس کا افسانہ "بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے "پڑھیں تو اس نے اس شعر میں بیان کی گئی حقیقت کو کہانی کے روپ میں پیش کیا ہے اب اس کا پہلا خاکہ دیکھئے۔وہ لکھتا ہے۔

"بیگم عزیز حسین کی نیکی کے سبب مجھے پندرہ سال کی عمر میں شوگر مل میں مزدوری مل گئی۔میں نے اپنی زندگی کے بے حد قیمتی انیس سال اس شوگر مل میں برباد کئے۔بیگم عزیز حسین کی نیک نیتی اور نیکی کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے لئے نیکی نہ کی ہوتی تو میں زیادہ بہتر حالت میں ہوتا"۔

حیدر قریشی کے دو شعر یوں ہیں۔

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

ماں کی محبت اور عظمت کے اظہار کا دوسرا طریقہ اس نے اپنے افسانے "ماتا" کے ذریعہ اختیار کیا۔

پھر اس نے تیسرے طریقے سے اپنے دوسرے خاکے میں ماں کی محبت کا فیصلہ کن اظہار یوں کیا ہے۔

"میری پہلی اور آخری محبت امی جی ہیں"

ان مثالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف واقعات کو سوچتے اور لکھتے وقت ان میں نئی معنویت تلاش کرتا ہے وہ اپنی سوچ کے مرکز سے نکل کر بعض اوقات سوچ کے دائرے سے باہر ایک نئے مدار میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے یہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک انشائیہ نگار بھی ہے مثلاً پہلے خاکے کے اختتام پر وہ لکھتا

ہے۔

"اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوت شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے"۔

یوں بھی انشائیے اور خاکے میں ایک تعلق یہ بنتا ہے کہ انشائیہ نگار مظاہر کی اندر کی شخصیت کو دریافت کرتا ہے اور پھر اسے ظاہر کرتا ہے اور خاکہ نگار کسی شخص کی اندر کی شخصیت کو تلاش کر کے واقعات کی روشنی کے ذریعے دنیا کو دکھاتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے نانا کے خاکے میں لکھتا ہے۔

"نانا جی .... کے ہاتھ سے اتنی محبت کے ساتھ ریوڑیاں کھانا، نانی جی کے لئے ناقابلِ یقین خوشی تھی..... نانی جی تو فوت ہو چکی تھیں، میرا خیال ہے وہ نانا جی جیسے سخت گیر شوہر کی محبت سے حیرت زدہ ہوئیں اور پھر اسی حیرت اور بے انتہا خوشی کے نتیجے میں فوت ہو گئیں"۔

پھر وہ اپنے تایا کے متعلق لکھتا ہے۔

"بابا جی خواتین کی محفلوں میں بیٹھ کے ہمیشہ خوش ہوتے۔ نماز کے قریب نہیں پھٹکتے تھے...."

وہ اپنے ماموں کے متعلق لکھتا ہے۔

"مذہبی ہونے کے باوجود ماموں ناصر خلاف شرع تھوک لینے کو عیب نہیں سمجھتے"۔

خاکہ نگاری میں ایک اور قبیح رسم یہ بھی چلی کہ خاکہ نگار مختلف مصلحتوں کے چولے پہن کر اپنے مخصوص مفادات کی خاطر مختلف لوگوں کے خاکے لکھتے وقت ان کی خامیوں کو بھی خوبیوں کے حسین ورقوں میں لپیٹ کر پیش کرنے لگے اس طرح بعض نہایت مکروہ شخصیتوں کو بھی اعلیٰ کردار کی حامل ظاہر کیا جانے لگا اس جرم کے عادی لوگ آج بھی دنیائے ادب میں بہت بلندیوں پر پرواز کر رہے ہیں مگر مجھے یہاں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ حیدر قریشی نے اپنی محبتوں اور نفرتوں سے ایک جیسا سلوک کرنے کی کوشش کی ہے شاید ایسا کرنے کے لئے اس کے اندر کے نقاد نے اس کی مدد کی ہے جو اسے جا بجا تنقید کرنے کی ترغیب دیتا ہے مثلاً اپنی والدہ کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

"ابا جی کی "دل پاور" کے کئی کرشمے دیکھنے کے باوجود امی جی نے انہیں بزرگ تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا"۔

وہ حقائق کا اظہار کرتے وقت اعتراف سے گریز نہیں کرتا۔ مثلاً اپنی بیوی کے متعلق لکھتا ہے

"اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرأت نہیں"

پھر اپنے تایا کا ذکر یوں کرتا ہے۔

''بابا جی کی زندگی میں ہی میرا ایک افسانہ "دھند کا سفر" نگار پاکستان کراچی میں چھپا تھا اس افسانے میں بابا جی اور میرے تعلق سے ایک واقعہ بھی درج ہے جو افسانہ نہیں حقیقت ہے وہ حقیقت اپنے افسانے سے نقل کرتا ہوں"۔

میں نے ابتداء میں ذکر کیا تھا کہ میرے نزدیک حیدر قریشی ہر رنگ میں محبت کا اظہار چاہتا ہے اور یہی اس کے ان خاکوں کی وجہ تخلیق ہے وہ بار بار اپنے باپ دادا کا ذکر کرتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو دادا بنے اور پھر اپنے آپ میں اپنے دادا کی شخصیت کو دیکھے اسی طرح باپ کا معاملہ تھا۔ دراصل وہ تسخیر ذات کا متمنی تھا اس نے زمین پر کھڑے ہو کر اپنے باپ کو پہلی منزل پر اور اپنے دادا کو اس سے اوپر کی منزل پر کھڑے دیکھا ہے اور اب وہ خود ان اوپر کی منزلوں پر کھڑے ہو کر نیچے زمین پر کھڑے حیدر قریشی کو دیکھنا چاہتا ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے باپ دادا سے سیکھا تھا کیا اس کی آئندہ نسل بھی اس سے اسی طرح فیضیاب ہونا چاہتی ہے یا نہیں۔

اظہارِ محبت میں کبھی کبھی جذباتی ہو جانا عین فطرت ہے چنانچہ حیدر قریشی نے بعض مقامات پر جذباتیت سے کام لیا ہے مثلاً جب وہ ساتویں خاکے میں لکھتا ہے۔

"میں اپنے پیچیدہ حالات کے باعث سنگین مسائل میں گھرا ہوا تھا میرے بعض سوتیلے عزیز جنہیں بعض دوسروں پر اپنے سوتیلے پن کا زہر نکالنا تھا مگر وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے انہوں نے ان کے متبادل کے طور پر مجھے ہی نشانہ بنا لیا، گھات ایسے لگائی کہ میرے ماں جایوں کو آگے کر دیا۔ قریبی عزیز دشمن بن گئے۔ خون کے رشتے "خونی رشتے" بن گئے۔ سوتیلے عزیز اپنی فتح پر نازاں تھے۔ میری مجبوری کچھ اور تھی۔

احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدرؔ

اس بار مگر بھائی تھے احباب نہیں تھے

ہر چند اب میں سنبھل گیا ہوں اور اس پوزیشن میں ہوں کہ سارے کرم فرماؤں کے قرض سود سمیت انہیں واپس کر دوں"۔

ہر چند وہ یہاں جذباتی ہوا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ جذبات ہی کی رو میں بہہ گیا ہو وہ بہکنے کا عادی نہیں اس لئے جلد ہی وہ اپنے جذبات پر قابو پا لیتا ہے خواہ وہ محبت کے ہوں یا نفرت کے۔ اس لئے وہ محبت اور نفرت کے اس امتزاج کو متوازن رکھنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کی تمام تر محبتیں اس کی گواہ ہیں۔ یقیناً اسی وجہ سے اس نے خاکوں کے اس مجموعے کا نام میری محبتیں رکھا ہے۔

حیدر قریشی کی تخلیقات سے انتخاب

ترتیب و انتخاب

سنجے گوڑ بولے

غزلیں

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر ، فرات آنکھوں میں

پھر اس کو دامنِ دل میں کہاں کہاں رکھیں
سمیٹ سکتے ہیں جو کائنات آنکھوں میں

تمہیں تو گردشِ دوراں نے روند ڈالا ہے
رہی نہ کوئی بھی پہلی سی بات آنکھوں میں

قطار وار ستاروں کی جگمگاہٹ سے
سجا کے لائے ہیں غم کی برات آنکھوں میں

وہ بے وفا کبھی اتنا بھی کب تھا بے گانہ
نہ بے رُخی نہ کوئی التفات آنکھوں میں

بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدرؔ
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

☆☆

اس طرح شہرِ انا پر میں تباہی مانگوں
اپنے ہونے سے نہ ہونے کی گواہی مانگوں

اُس کے ہونٹوں پہ پھر مہکوں تمنّا بن کر
پھر وہ چاہت جو کبھی اس نے تھی چاہی ،مانگوں

یہ تو ہوگا کہ میں بھڑکوں گا یا بُجھ جاؤں گا
یوں سُلگنے سے تو بہتر ہے ہوا ہی مانگوں

اُس کو پانے کی تمنّا پہ یقیں کب ہے مگر
ہاتھ جب اُٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدرؔ
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

☆☆

غموں سے اِس کو ہمیشہ نہال رکھتا ہے
ہمارے دل کا وہ کتنا خیال رکھتا ہے

نہ گلبدن ہے نہ چشمِ غزال رکھتا ہے
وہ سادگی میں ہی اپنا کمال رکھتا ہے

مِری جوانی کے ہیں ماہ و سال جس کے پاس
وہ بے وفا بھی زمانے کی چال رکھتا ہے

پھر اُس کے وصل میں کیا جانے کتنی لذت ہو
وہ جس کا ہجر بھی لطفِ وصال رکھتا ہے

تمام زخم اُسی نے عطا کئے حیدرؔ
ہر ایک زخم کا جو اندمال رکھتا ہے

☆☆

محبتوں میں تم سے جو نباہ بھی نہ کر سکا
تمہارے بعد پھر کسی کی چاہ بھی نہ کر سکا

ہمارے نامۂ عمل میں کچھ بھی تو نہیں ملا
کہ بے نصیب دل اسے سیاہ بھی نہ کرسکا

کہاں وہ کر سکا ہے نیکیاں بھی کام کی کبھی
جو زندگی میں ڈھنگ کا گناہ بھی نہ کرسکا

کمالِ ضبط تھا اِدھر، کمالِ خامشی اُدھر
میں آہ بھی نہ کر سکا وہ واہ بھی نہ کر سکا

لگن مسافتوں کی حیدرؔ اس قدر رہی کہ میں
ابھی تک اختیار کوئی راہ بھی نہ کر سکا

☆☆

شوق جو سود یا زیاں کے تھے
سلسلے وہم اور گماں کے تھے

طُور سے بڑھ کے اپنا حال ہوا
صرف اک بار مَن میں جھانکے تھے

جانے کیسے یہاں چلے آئے
ہم کسی دوسرے جہاں کے تھے

رنگ سارے نظر کا تھے جادو
اور سب ذائقے زباں کے تھے

قسمتوں نے ملا دیا ورنہ
تم کہیں کے تھے، ہم کہاں کے تھے

داستاں گو کی ذات سے اُبھرے
جتنے کردار داستاں کے تھے

آج تو کُھل کے ہنس دیئے حیدرؔ
دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

☆☆

تمہارے نام کے ساتھ اپنے نام کا مطلب
وہی جو ہوتا ہے رادھا سے شام کا مطلب

جو اپنی ہجر بھری زندگی گذار گیا
وہ جان لے گا وصالِ دوام کا مطلب

اسے خبر ہے کہ رُوئے سخن ہے کس جانب
کہاں وہ سمجھے گا میرے کلام کا مطلب

نمازِ عشق تو پروانہ وار ہوتی ہے
پھر اس میں سجدہ، رکوع و قیام کا مطلب

سجایا خانۂ دل جن کے واسطے حیدرؔ
وہی نہ سمجھے مرے اہتمام کا مطلب

☆☆

جب اُس نے خاک اڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کر لیا ہے

حدیں وہ کر گیا ہے پار سب جور و ستم کی
سو ہم نے صبر پہلے سے زیادہ کر لیا ہے

نہیں، اس جیسی عیاری تو ممکن ہی نہیں تھی
زمانے سے ذرا بس استفادہ کر لیا ہے

کچھ ایسا ہے کسی کی سر زمینِ دل کا جادو
محبت کا سفر اب پا پیادہ کر لیا ہے

چلو حیدرؔ غنیمت ہے یہ صندل کی مہک بھی
کہ یاروں نے تو لکڑی کا برادہ کر لیا ہے

☆☆

وہ جو ابھی تک خاک میں رُلنے والے ہیں
سُچے موتیوں میں اب تلنے والے ہیں

اپنی ذات کے دروازے تک آ پہنچے
بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم
سو اب اُس کے عشق میں گھلنے والے ہیں

واقفیت ہے اِن سے اپنی برسوں کی
دُکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں

آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری
حیدرؔ مَیل دِلوں کے دُھلنے والے ہیں

☆☆

موسم کی بے مہر فضا میں گرتے ہیں
سوکھے پتے سرد ہوا میں گرتے ہیں

رہتی ہے پرواز کی خوش فہمی اُن کو
جو اپنے اندر کے خلا میں گرتے ہیں

گرتے ہیں تو گرتے ہی جاتے ہیں پھر
اہلِ ستم جب مکروریا میں گرتے ہیں

گیت سناتے ہیں جھرنے کے گرنے کا
حرف جو خاموشی کی صدا میں گرتے ہیں

تم نے وہ منظر ہی کب دیکھے ہیں، جب
درد سمندر، دل دریا میں گرتے ہیں

یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدرؔ
یا اب پیہم اَشک دُعا میں گرتے ہیں



جو بَس میں ہے وہ کر جانا ضروری ہو گیا ہے
تری چاہت میں مَر جانا ضروری ہو گیا ہے

ہمیں تو اب کسی اگلی محبت کے سفر پر
نہیں جانا تھا، پر جانا ضروری ہو گیا ہے

ستارا جب مِرا گردش سے باہر آرہا ہے
تو پھر دل کا ٹھہر جانا ضروری ہو گیا ہے

درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں
خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہو گیا ہے

اندھیرا اِس قدر گہرا گیا ہے دل کے اندر
کوئی سورج اُبھر جانا ضروری ہو گیا ہے

بہت مشکل ہوا اندر کے ریزوں کو چھپانا
سو اب اپنا بکھر جانا ضروری ہو گیا ہے

تجھے میں اپنے ہر دُکھ سے بچانا چاہتا ہوں
ترے دل سے اُتر جانا ضروری ہو گیا ہے

نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اِس دل پہ حیدرؔ
پُرانے زخم بھر جانا ضروری ہو گیا ہے

خلا

کبھی تم دل میں بستے تھے
تو آنکھوں میں
کہیں اندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
بہاریں مسکراتیں،
کہکشائیں رقص کرتی تھیں
زمین وآسماں میں
ایسی یکتائی کا عالم تھا
خلا کیسا؟
کہیں اک درز تک بھی تو نہیں
معلوم ہوتی تھی
مگر پھر یوں ہوا، اک دن
دھماکہ سا ہوا کوئی
زمین وآسماں میں اک دوئی
پیدا ہوئی
پھر فاصلہ در فاصلہ
اک سلسلہ بنتا گیا
اور اب یہ عالم ہے
بہاریں کھو چکی ہیں
کہکشائیں بجھ گئی ہیں

اور مری آنکھوں میں
اک اندھا خلا ہے
دور تک پھیلا ہوا، جس میں
لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کو سجائے
چپ کھڑی ہے میری تنہائی،
اور اس کے گرد
اک سفّاک سناٹا
مسلسل
رقص کرتا ہے!

درد

گھرے سناٹے میں
دُور سے
کالے انجن کی سیٹی کی آواز آتی ہوئی
دل کو بھاتی ہوئی
اک لرزتی، سسکتی صدا

دُور ہوتے ہوئے
کسی تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز
تانگے کے پہیوں کی آواز سے مل کے
کوئی انوکھا سا جادو جگاتی ہوئی
دکھ کا احساس دیتے ہوئے
دُور ہوتے ہوئے
منظروں کی صدا!

چوڑیوں کی چھنک
ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک
زخم خوردہ مگر مسکراتے ہوئے
گیت گاتی چھنک

بانسری کی دُکھی اور سُریلی صدا
سَرخوشی اور دُکھ کے رَچاؤ سے
دل میں کچھ ایسے اترتی ہوئی
جیسے الہام ہو

یہ ساری صدائیں مری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں اِن سب کو پہچانتا ہوں
متاعِ فقیراں ---------
یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں

درد
جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں!

ایک اداس کہانی

یہ کیسی دُھند سی پھیلی ہے
میرے چار سُو
کچھ بھی نظر آتا نہیں
چاروں طرف مہکے ہوئے، پھیلے ہوئے
شادابیوں، زرخیزیوں کے
کتنے ہی منظر ہیں
لیکن دُھند نے سارے مناظر
اپنے دامن میں کچھ اِس ڈَھب سے چھُپائے ہیں
مری نظریں کسی منظر کو بھی
چھو ہی نہیں پاتیں
مگر کانوں میں سارے منظروں کی
مدھ بھری جھنکار پیہم گونجتی ہے
کوئی انجانی (یا شاید جانی پہچانی سی)
راحت بخشتی ہے
صدا جھنکار اور چہکار کی صورت
رگِ جاں تک اُترتی ہے
لہو میں بولتی ہے
روح میں رس گھول دیتی ہے

مگر دل میں نہیں آتی
کہ دل کے دیس میں آنے کے سارے راستے
آنکھوں سے آتے ہیں
یہ کیسی دُھند ہے جس نے مجھے تقسیم کر کے رکھ دیا ہے
مِرا دل میری جاں کی
اور مِری جاں، میرے دل کی جستجو میں ہے
مگر دونوں میں کوئی ربط ہو پایا نہیں جیسے

عجب سی دُھند پھیلی ہے
سبھی منظر صدا کے رُوپ میں ہی مجھ سے ملتے ہیں
یہ دلکش دُھند
دو قطروں کی صورت
جب سے اِن پلکوں پہ ٹھہری ہے!

ماہیے

نمازِ عشق

اک ''فجر'' آغاز ہوئی
درد میں ڈوبے ہوئے
اس دِل کی نماز ہوئی

پھر بعد زوال ہمیں
''ظہر'' نے بخشی ہے
اُمیدِ کمال ہمیں

جب ''عصر'' اشارہ ہوا
سُود میں ڈھلنے لگا
جتنا بھی خسارہ ہوا

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
''مغرب'' کی اذان ہوئی

جب وقتِ ''عشاء'' آیا
یاد تری آئی
اور وقتِ دعا آیا

مومن تھا دلِ بد میں
جس نے جگا ڈالا
پھر وقتِ ''تہجد'' میں

متفرق ماہیے

منظر ترے گاؤں کے
گرم دو پہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

بجلی کے لگے کھمبے
کٹ گئے، رستے میں
جو پیڑ بھی تھے لمبے

پگڈنڈیوں کے دِل دھڑکیں
بستی میں پکّی
جب بچھنے لگیں سڑکیں

مونجی کی چھڑائی تھی
پہلے پہل بکئے
جب آنکھ لڑائی تھی

نہیں ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

دل کو شاداب کیا
تیری محبت کے
غم سے سیراب کیا

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

تھے دیس میں پردیسی
آ کے ولایت میں
اب ہو گئے ہیں دیسی

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

کچھ دل کو ملوک کرو
ویسے چَن ماہی
جو چاہے سلوک کرو

چڑھتے ہوئے جامن پر
داغ لگا بیٹھے
ترے پیار کا دامن پر

رُت آ گئی پھولوں کی
جان کے ہوتی ہوئی
معصوم سی بھولوں کی

لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

چاہت کی گواہی تھے
ہم بھی کبھی یارو
اک ہیر کے ماہی تھے

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہو ولیوں کی

ایٹمی جنگ کے بعد کے پس منظر میں لکھی گئی حیدر قریشی کی کہانی

کاکروچ

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

''ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیشِ نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے''

نصیر حبیب نے میری بات کو دلچسپی سے سنا اور کہا: ''کہانی کا خیال سناؤ''۔ لیکن اسی دوران مسعود شاہ بول اُٹھا: ''یار! تم اب تک اسی موضوع پر پہلے ہی دو کہانیاں لکھ چکے ہو۔ اس موضوع کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ لگتا ہے ایٹمی جنگ کرا کے ہی رہو گے'' مسعود شاہ اپنے مزاج کے لاابالی پن کے باعث جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔

''کہانی کا خیال سناؤ!'' نصیر حبیب نے پھر پہلے لہجے میں کہا۔

''چلو یار! اب کہانی سُنا بھی چکو'' مسعود شاہ نے بے زاری کے ساتھ جیسے نصیر حبیب کا ساتھ دیا۔

''اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے ہوتا ہے۔ میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔۔۔۔۔ میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو گئی ہے۔ تاہم کرۂ ارض پر ہماری حالت ایسے ہے جیسے انسان ابھی ابھی غار کے زمانے سے نکل کر جنگل میں جھونپڑے بنا رہا ہے۔

میرے پوتے' پوتیاں اور نواسے' نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم تر ترقیات کے دور سے نکل کر جنگل کے دور میں آ گیا ہے۔''

میں دیکھتا ہوں کہ نصیر حبیب ہی نہیں' مسعود شاہ بھی میری کہانی کو سنجیدگی سے سُن رہا ہے۔

''ایک دن میرے پوتوں' پوتیوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں انہیں عام معمول سے ہٹ کر کوئی انوکھی سی کہانی

سناؤں۔ تب میں انہیں اپنے ترقی یافتہ دور کے حالات بتانے لگتا ہوں:

'میرے پیارے بچو! یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ اس کے باوجود کہانی سے زیادہ دلچسپ اور المناک ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے ساری دنیا ہم جیسے انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ انسان کو دنیا میں ہر طرح کی نعمتیں میسّر تھیں۔ سفر پر جانا ہو تو کار سے لے کر ہوائی جہاز تک کی سہولتیں موجود تھیں۔'

'دادا اَبو! یہ کار اور ہوائی جہاز کیا ہوتے تھے؟'

میری پوتی نے سوال کیا تو مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ کار ایک سواری تھی جس میں چار پانچ آدمی بیٹھ جاتے۔ اسے صرف ہینڈل کرنا ہوتا تھا۔ وہ خود ہی سواریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی۔ یہاں سے دریا کے کنارے تک کا جو فاصلہ ہم آدھے دن میں طے کرتے ہیں' کار ہمیں پل بھر میں وہاں پہنچا دیتی تھی۔

بچوں کے چہروں سے تجسّس اور دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

'اور دادا اَبو!۔۔۔ ہوائی جہاز؟' میرے پوتے نے پوچھا

'ہوائی جہاز بہت بڑا ہوتا تھا۔ اس میں کئی سو افراد بیٹھ جاتے تو وہ انہیں اتنی دور تک پہنچا دیتا جتنی دور تم اپنی ساری زندگی میں بھی نہیں جا سکو گے۔ اور ہاں۔۔۔ ہوائی جہاز پرندوں کی طرح اُڑ کر جاتا تھا۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے بھی اوپر سے گزر جاتا تھا۔'

میری بات سُن کر بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

'دادا اَبو! اور کیا ہوتا تھا آپ کے زمانے میں؟' اس بار میرے پوتے کے لہجے میں شرارت کی چمک تھی۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بتانے لگا کہ: 'اُس زمانے میں ریڈیو' ٹیلی ویژن' ٹیلی فون' فیکس۔۔۔۔'

'دادا اَبو! یہ ریڈیو کیا ہوتا تھا؟'

'یہ ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا۔ اس کے بٹن گھمانے سے کبھی گیت سنائی دیتے۔ کبھی ساری دنیا کی خبریں' کبھی لوگوں کی گفتگو۔'

'اور ٹیلی ویژن؟'

'ریڈیو والی ساری چیزیں ٹیلی ویژن پر سُنائی بھی دیتی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھیں۔ یعنی اگر کوئی آواز آ رہی ہے تو اس کا چہرہ بھی دکھائی دیتا اور وہ شخص ہماری طرح ہی چلتا پھرتا اور بولتا نظر آتا تھا۔'

ننھے منّے معصوم بچوں نے میری بات سُن کر اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے پہلے زمانے کی اور دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں مگر میں کہتا ہوں: پیارے بچو! میں اب تھک گیا ہوں اس لئے باقی باتیں

اب کل سُناؤں گا۔

پھر میں اُن کے جھونپڑے سے نکل آتا ہوں۔جھونپڑے سے باہر آکر یونہی خیال آیا اور میں رُک کر بچوں کی آوازیں سننے لگا۔میرا ایک پوتا کہہ رہا تھا:'دادا اَبو زیادہ بوڑھے ہوگئے ہیں'اس لئے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں۔'

میرے باقی سارے پوتے پوتیاں'نواسے'نواسیاں اس کے تبصرے کی تائید میں ہنس رہے تھے۔''

میں نے کہانی ختم کی تو مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔''یار!اگر جنگ میں صرف تم اور ایک عورت ہی بچتے ہو تو بچوں کی شادیاں کیسے کیں؟ کیا پھر بہن بھائیوں کی شادیاں کرادیں؟''

''اگر آپ کو اس میں الجھن محسوس ہوتی ہے تو جنگل کے قریب دریا کے کنارے ایک اور مرد،عورت بھی جنگ سے بچادیتا ہوں''میں نے وضاحت کی۔

''یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو کہانی لکھتے وقت خود اپنی راہ بناتی جائیں گی۔میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں''نصیر حبیب نے سنجیدگی سے کہا''ایٹمی جنگ کے بعد سطحِ زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔اس لئے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر بچارہے ہیں؟''

''میری کہانی بنیادی طور پر فکشن ہے۔اسے آپ سائنسی مضمون تو نہ سمجھیں''میں نے نصیر حبیب کے اعتراض کے جواب میں کہا۔

''میں تو فکشن کی اہمیت کا معترف ہوں''نصیر حبیب نے متانت سے کہا''بلکہ میرے نزدیک سائنس کی بنیاد بھی فکشن پر ہے۔ہر نیا سائنسی انکشاف پہلے فکشن ہوتا ہے۔اس لئے میں نے جو نکتہ اُٹھایا ہے پہلے مجھے اس کی تفصیل بیان کر لینے دیں۔''

میں تو نصیر حبیب کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا ہی'مسعود شاہ بھی خلافِ توقع سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''سطحِ زمین پر ایٹمی جنگ کی صورت میں کوئی ذی رُوح مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔صرف وہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے جس میں nuclear poison ہو۔صرف یہی element ہر قسم کی تابکاری کو جذب کرسکتا ہے۔مثلاً lead ہر قسم کی تابکاری کو جذب کرسکتا ہے لیکن اگر انسانی جسم میں lead شامل ہو تو پھر اسے ہلاک کرنے کے لئے ایٹمی جنگ کی بھی ضرورت نہیں'انسان ویسے ہی مرجائے گا''

''آپ کا مقصد یہ ہے چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لئے اس کی موت واقع ہوجائے گی۔لیکن بعض ذی رُوح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے۔مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی الگ تھیلی ہوتی ہے'اس لئے اگر اس کے جسم میں nuclear poison ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہوگی''

میری بات سُن کر نصیر حبیب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔''آپ کی کہانی اب بنے گی۔مکھی کی جگہ کاکروچ لے لیں۔فرض کرلیں کہ کاکروچ کے وجود میں بھی ایسا سسٹم ہے کہ تابکاری اثرات اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا اس کی Growth کرتے ہیں۔لہٰذا ایٹمی جنگ کے بعد سارے ذی رُوح مرجائیں گے سوائے کاکروچ کے۔اور تابکاری اثرات سے جب ان کی Growth ہوگی تو آنے والے زمانے میں اس زمین کے حکمران اور مالک یہی کاکروچ ہوں گے جو انسانی قد کے برابر ہوجائیں گے''

نصیر حبیب کی کہانی سُن کر مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ٹھہریں!''میں نے ہاتھ اُٹھا کر سنجیدگی سے کہا''کہانی تو ہزاروں سال پہلے بن چکی ہے''

نصیر حبیب نے مجھے الجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔

''دوستو!ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں''

''کیا؟''نصیر حبیب اور مسعود شاہ کی آوازوں میں گھبراہٹ تھی۔

اور پھر وہ اس طرح اپنے آپ کو دیکھنے لگے جیسے واقعی کسی پرانے زمانے کے کاکروچ ہوں۔

بریگیڈیئر صاحب اچھے ادبی ذوق کے مالک ہیں۔مجھے انہوں نے کئی بار محبت کے ساتھ اور ایک بار ڈانٹ کر داددی۔میں کبھی اپنی کوئی تازہ غزل،افسانہ یا خاکہ انہیں برائے مطالعہ دیتا تو اس کی تعریف کے ساتھ تجزیاتی نوٹ بھی ساتھ لکھا آتا۔ایک بار ایک غزل کے ساتھ ان کی ''جواب آں غزل''موصول ہوئی تو پتہ چلا کہ انہیں شعر کے وزن کا بھی علم ہے۔افسانہ''کاکروچ''پڑھنے کے بعد ایک دفعہ بعض اساتذہ سے کہنے لگے:میں حیران ہوں یہ اردو کے ٹیچر ہیں یا سائنس کے۔ایک بار میری کلاس میں آئے اور کالج کے طلبہ سے کہنے لگے:آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسا...ادیب آپ کا استاد ہے...ان سے علم حاصل کرنے کے لئے انہیں نچوڑ لیں۔پھر مسکرا کر بولے لیکن بلی کی طرح نہلا کر نہیں نچوڑیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی کے خاکہ''**عاجزی کا اعجاز**''سے اقتباس

(بحوالہ''میری محبتیں''،صفحہ نمبر ۱۴۱۔۱۴۲)

ایک صوفی کے جلال و جمال کے بارے میں حیدر قریشی کی حیرت انگیز کہانی

بابا جمالی شاہ کا جلال

وادیٔ حیرت میں حیدؔر دیکھ لو
سارے فرزانے ٹھکانے لگ گئے

جو کچھ جیلے کے ساتھ ہو گیا ہے، کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اس پر اور اس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

مولوی عطاء الرحیم پہلے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں کی چھوٹی سی مسجد میں نمازیں پڑھاتے، گاؤں والوں کو خدا، رسول کی باتیں سناتے۔ گاؤں والوں کو اُن کی باتیں سمجھ میں آتیں یا نہ آتیں لیکن سارے لوگ اُن کی بہت عزّت کرتے۔ حالات نے پلٹا کھایا تو وہ گاؤں سے شہر آ گئے۔ یہاں ترقی کرتے کرتے وہ شہر کی جامع مسجد کے امام بن گئے: دیکھتے ہی دیکھتے پہلے موٹر سائیکل، پھر کار اور آخر کار پجارو کے مالک بن گئے۔ اب اُن کا رعب دبدبہ بھی بہت ہو گیا تھا۔ ہر شعبۂ حیات کے لوگ اُن کی خوشامد کرتے۔ اُن کے آگے آنکھیں بچھاتے چلے جاتے۔ لوگوں کی خوشامد اور دولت کی ریل پیل نے انہیں وسیع المشرب اور راسخ العقیدہ عالم کی جگہ متعصّب اور کٹڑ پن کا شکار مولوی بنا دیا تھا۔

اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ جیلے کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں شاید تھوڑا سا میرا بھی قصور ہے۔ میں نے ایک دفعہ اسے ایک مجذوب کا قصّہ سنایا تھا۔ مغلیہ دور میں جب ایک اہم مغل بادشاہ کی تیار کرائی ہوئی عالی شان مسجد میں پہلی نماز ہونے لگی تو ایک مجذوب بھی نماز کے مقتدیوں میں شامل ہو گیا۔ مغلوں کے مقرر کردہ امام نے نماز شروع کی تو اُس مجذوب نے بلند آواز میں کہا: ''جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے''۔ مغل بادشاہ، اُن کے سرکاری امام اور سارے درباریوں کو مجذوب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ نماز کے بعد اُس مجذوب کو ڈانٹا گیا تو اُس نے بڑی سادگی سے کہا میرے قدموں کے نیچے کی زمین کھود کر دیکھ لو، میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے اسی وقت وہاں کھدائی کی گئی تو ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ سب لوگ اس واقعہ پر ابھی حیران ہی تھے کہ اُس مجذوب نے کہا:

نماز شروع کرتے ہی امام نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاہی مسجد کی پہلی نماز پڑھا رہا ہوں۔ ظلِ الٰہی بنفسِ نفیس حاضر ہیں۔ کم سے کم سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تو ضرور انعام میں عطا کریں گے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔

مجذوب نے یہ بات کہی اور یہ جا، وہ جا۔۔۔ بادشاہ اور درباری حیران اور امام صاحب شرمندہ و پریشان۔

جب میں نے جیلے کو یہ قصہ سنایا تھا اس کی آنکھوں میں معصومانہ حیرت تھی۔ پھر وہ مجھ سے وقتاً فوقتاً صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے حالات پوچھتا اور سنتا رہتا۔ پھر کہیں ایک دن اُس نے اپنے باپ مولوی عطاء الرحیم کے سامنے بھی چند قصّے دہرائے تو مولوی عطاء الرحیم بھڑک اُٹھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اُن کا بیٹا اس حد تک ''گمراہ'' ہو چکا ہے۔ انہوں نے بڑی مہارت سے جیلے کو کنٹرول کیا۔ چنانچہ ایک مختصر سے وقفہ کے بعد میری جیلے سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے مولوی باپ کے عطا کردہ علم کے باعث اپنی معصومیت اور حیرت کھو چکا تھا۔ اب وہ مجھے بتا رہا تھا یہ سب مجذوب اور فقیر ڈھونگی ہوتے ہیں۔ اولیاء کو مجذوبوں کے ساتھ نہیں ملانا چاہئے۔ پھر وہ مجھے تصوف کی تعریف اور اس کے بعض مراحل کی بابت بتانے لگا، جو ظاہر ہے مولوی عطاء الکریم نے اپنے کچے پکے علم کی بنیاد پر اسے رٹا دیا تھا۔ میں نے اسے توجہ دلائی کہ تصوف کے بارے میں جاننا اور صوفیانہ تجربے سے گزرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن میری بات اب جیلے کی نظر میں جچ نہیں رہی تھی۔ الٹا وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ مغلیہ دور کے امام سے الجھنے والا مجذوب دراصل ملحد تھا، پورا کلمہ نہیں پڑھتا تھا اسی لئے اسے قرآن و سنّت کی روشنی میں قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ اُس مجذوب کی شہادت میں مذکورہ امام کی سازش شامل تھی جس نے اپنی سُبکی کا بدلہ لینے کے لئے مذہبی عقائد کا ڈرامہ کیا تھا۔ بس اُسے اتنی نصیحت کر دی کہ وہ کسی مسلک پر کاربند رہے لیکن کبھی کسی فقیر سے نہ الجھے۔

☆☆☆

بابا جمالی شاہ شہر کے درمیان میں واقع قبرستان میں ہی اکثر دیکھے جاتے تھے۔ کبھی کبھار شہر کی سڑکوں پر بھی اپنی دُھن میں جاتے نظر آ جاتے تھے۔ کسی کی دعا کی درخواست قبول کرنا اُن کے مُوڈ پر منحصر تھا لیکن جس کی دعا کی درخواست قبول کرتے فوراً ہاں یا نہ میں جواب دے دیتے تھے۔ خود میں نے اپنے دسویں کے امتحان کے بعد ان سے کہا تھا کہ جمالی بابا دعا کریں میں دسویں میں پاس ہو جاؤں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اُن کے بے آواز ہونٹ ایسے ہلے جیسے خدا سے دعا کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا: جا بچہ! تُو پاس ہو گیا۔۔۔ اسی لمحے مجھے خیال آ گیا کہ فرسٹ ڈویژن بھی مانگ لوں۔ چنانچہ میں نے جمالی بابا سے پھر فرسٹ

ڈویژن میں پاس ہونے کی دعا کے لئے بھی کہہ دیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا، پھر اُسی طرح بے آواز ہونٹ ہلانے لگے۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان میں مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگے یہ دعا بھی پوری ہوگئی۔ قدرت خدا کی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔ تاہم کسی کی دعا کی درخواست سننا بابے جمالی شاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ عموماً وہ بڑے لوگوں کی درخواست پر دھیان نہیں دیتے تھے۔

ایک بار علاقے میں بارشیں نہیں ہوئیں۔ فصلوں کے نقصان اور قحط کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ تب مولوی عطاء الرحیم نے ایک دن پہلے سارے شہر میں نماز استسقاء کے لئے اعلان کرایا اور اگلے دن بڑی عید گاہ میں نماز استسقاء پڑھائی، لیکن بے سود!۔۔۔۔۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد بعض غریب غرباء بابا جمالی شاہ کے پاس بارش کی دعا کرانے کے لئے گئے۔ بابا جمالی شاہ نے اپنے معمول کے مطابق آنکھیں نہیں موندیں۔۔۔ مزاروں سے کھجور کی چند چھڑیاں اُٹھائیں اور سڑک پر آ گئے۔ انہوں نے وہ چھڑیاں زور زور سے سڑک پر مارنا شروع کر دیں۔ سڑک پر دو تین بار چھڑی مارنے کے بعد ایک بار آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھتے اور پھر جیسے ڈانٹنے کے انداز میں کہتے:

''اوئے مینہ برساتا ہے یا نہیں؟۔۔۔ میں کہتا ہوں مینہ برساؤ!''

میرا خیال ہے ہر بندے کی خدا کے ساتھ تعلق کی اپنی ہی نوعیت ہوتی ہے۔ خدا تو اندر کے سارے بھید جانتا ہے۔ وہ کسی کی عاجزی میں ریاکاری کی بُو پائے اور اسے دھتکار دے اور کسی کی بے ادبی جیسی بے تکلفی میں بھی محبت کی خوشبو پائے اور اُس کے ناز اُٹھالے۔ بابا جمالی شاہ ساری چھڑیاں سڑک پر مار مار کر توڑ چکے تو پھر قبرستان واپس چلے گئے لیکن سارے شہر نے دیکھا کہ گھنگھور گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں۔ پھر ایسی برسات ہوئی کہ قحط کے سارے خوف ڈھل گئے۔

ویسے تو مولوی عطاء الرحیم اس واقعہ کے بعد سے ہی بابا جمالی شاہ کے سخت خلاف ہو گئے تھے لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک بار مولوی صاحب کو رات کی تاریکی میں بابا جمالی شاہ کے پاس جاتے دیکھا تھا۔ شاید مولوی صاحب نے انہیں دعا کی درخواست کی ہو اور بابا جمالی شاہ نے انہیں جواب ہی نہ دیا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد پتہ چلا کہ مولوی عطاء الرحیم کی رپورٹ پر بابا جمالی شاہ کو پڑوسی ملک کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن گرفتاری کے تیسرے ہی روز پتہ چلا کہ بابا جمالی شاہ پر تشدد کرنے والا اچھا تا تھانیدار پاگل ہو گیا ہے اور اور تھانے کے عملہ نے خوفزدہ ہو کر بابا جمالی شاہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مولوی عطاء الرحیم کے غیض و غضب میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ان کے اشارے پر ان کے بیٹے جیلے نے بہت سارے بچوں کو ٹافیوں کا لالچ دے کر وقتاً فوقتاً بابا جمالی پر پتھراؤ کرنے اور انہیں پاگل پاگل کہنے کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسے مجذوبوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن وہ بابا جمالی شاہ کو کوئی بہت بڑا مکّار قرار دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بابا جمالی شاہ مسمریزم کا عمل جانتا ہے اسی لئے تھانے والوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

☆☆☆

آج بعد نماز عصر نوجوانوں کا ایک گروہ ایک جنازہ اٹھائے ہوئے بابا جمالی شاہ کے پاس پہنچا تھا۔ یہ سارے لڑکے جیلے کے دوست یا واقف کار تھے۔ میّت کے طور پر جیلا لیٹا ہوا تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ پہلے بابا جمالی سے کہیں گے کہ ایک میّت ہے اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ جب بابا جنازہ پڑھا دیں گے تو پھر سب مل کر بابا کا مذاق اڑائیں گے۔ اس پروگرام کا روحِ رواں جیلا تھا، اسی لئے وہ خود میّت بنا پڑا تھا۔ لڑکوں نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بابا جمالی شاہ سے کہا کہ یہ ایک میّت ہے اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ بابا نے نمازِ جنازہ پڑھانی شروع کر دی۔ حالانکہ پیچھے کوئی صف بھی نہیں بنی تھی، نہ ہی کوئی اور نمازِ جنازہ میں شریک تھا، بابا جمالی اکیلے ہی لگے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے آخری سلام پھیرا تو لڑکوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اور کہنے لگے: بابا جمالی! یہ تو مولانا عطاء الرحیم کا بیٹا جیلا ہے اور زندہ ہے۔

تب بابا جمالی شاہ نے بڑے جلالی انداز میں کہا:

''یہ جو کوئی بھی تھا اب صرف قیامت کے دن ہی اُٹھے گا کیونکہ اس کا جنازہ جمالی شاہ نے پڑھا دیا ہے''

تمام حاضرین پر سکتہ طاری ہوگیا۔ جیلا واقعی مر چکا تھا۔

جو کچھ جیلے کے ساتھ ہوگیا ہے، کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اس پر اور اس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا، اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ **ڈاکٹر فہیم اعظمی**

(حیدر قریشی کے افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' کے فلیپ پر درج رائے سے اقتباس)

برگد کا پیڑ

(ابا جی)

گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک رُوح میں مہکار کا احساس باقی ہے

باپ بیٹے کے مابین اوّلین تعارف کا کوئی واقعہ بیان کرنا اس لحاظ سے بے معنی سی بات ہے کہ یہ تعارف تو خون کے اجزا میں سے ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل ہے۔صدیوں پہلے ہم اپنے آباؤ اجداد کے لہو میں موجزن تھے۔اپنی پیدائش سے پہلے میں ابا جی کے لہو میں رواں تھا تو ابا جی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں۔اس کے باوجود شعوری سطح پر ابا جی سے میرا پہلا معانقہ اُس وقت ہوا جب میری عمر تقریباً تین سال تھی۔یہ واقعہ آج بھی میرے شعور میں ایک ہیولے کی طرح موجود ہے۔یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔چنانچہ جیسے ہی موقعہ ملتا الاسٹک والی نیکر اور چُچ بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس پہن لیتا۔ایسا ایک موقعہ مجھے اُس وقت مِلا جب امی جی سامنے والے گھر کی بُوا زیبو کے ہاں گئیں اور میں فطری لباس پہنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔رحیم یار خاں کے محلّہ قاضیاں سے (موجودہ) جدید بازار تک کئی پیچ دار رستوں سے نجانے میں کس طرح گزرتا چلا گیا۔

ابا جی وہاں اپنے ایک دوست ممتاز صاحب کی دوکان پر کھڑے تھے۔میں جا کر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔انہوں نے سمجھا کہ کسی کا بچہ ہے جو خوامخواہ ان سے چمٹ گیا ہے۔چنانچہ میرے معانقہ کے جواب میں انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے اپنے سے الگ کر کے پرے کر دیا۔میں پھر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔اس بار پھر انہوں نے دیکھے بغیر مجھے پرے دھکیل دیا اور میں اپنے حواس درست کئے بغیر تیسری بار پھر ''ابوا'' کہہ کر ان کی ٹانگوں سے معانقہ کرنے لگا۔لیکن اب اس سے پہلے کہ ابا جی مجھے پھر پرے دھکیلتے ممتاز صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔انہوں نے حیران ہوتے ہوئے ابا جی سے کہا: قریشی صاحب! یہ تو حیدر

ہے۔۔۔اب جو ابا جی نے پلٹ کر دیکھا تو میری میلی کچیلی، ننگ دھڑنگ حالت ہی میں مجھے اُٹھا لیا۔پھر سب کچھ بھول بھال کر گھر کی طرف چل دیئے۔راستہ بھر بار بار مجھے خود سے لپٹاتے اور چومتے جاتے۔گھر پہنچے تو وہاں میری گمشدگی پر کہرام برپا تھا۔یہ ابا جی سے گویا شعوری سطح پر میرا پہلا تعارف تھا۔

ابا جی وضع دار انسان تھے۔روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رُومی ٹوپی پہنتے رہے۔اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔آج ابا جی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے۔ان کی زندگی کے ابتدائی ایام میں دراوڑ حاوی رہا۔عالمِ شباب میں نواب بھاولپور تک رسائی حاصل کر کے انہیں بھاول نگر محکمہ پولیس میں محرر لگوایا گیا۔جب سارا سامان باندھ کر روانہ ہونے کا وقت آیا تو دادا جی نے دبی زبان سے کہا: بیٹا! ۔۔۔تو پھر جا رہے ہو؟۔۔۔اچھا جاؤ، ۔۔۔۔۔ویسے دل نہیں کرتا کہ جاؤ۔

ابا جی نے فوراً کہا: دل تو میرا ابھی نہیں کرتا کہ جاؤں۔اس لئے نہیں جاتا۔۔۔یہ کہہ کر بندھا ہوا سامان کھول ڈالا۔

ابا جی نے یہ قصہ بڑے مزے لے کر ہمیں سنایا تھا اور پھر کہا تھا: بھئی ہم سرائیکی لوگ تو اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہی پردیسی ہو جاتے تھے۔یہ واقعہ تقسیم برِصغیر سے پہلے کا ہے۔اگر ان پر ان کے اندر کا دراوڑ حاوی نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔بعد میں جب خراب حالات مسلسل حملہ آور ہونے لگے تو یوں لگا جیسے دراوڑ مغلوب ہو گیا ہے اور ابا جی کے اندر کا آریا فاتح ہو گیا ہے۔رحیم یار خاں والا گھر فروخت کیا گیا تو ابا جی کے چہرے پر کوئی کرب نہیں تھا۔میں تب صرف دس برس کا تھا مگر وہ نہ صرف آج بھی میرے نہاں خانۂ دل میں آباد ہے بلکہ مجھے جب بھی رحیم یار خاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، میں اس گھر کو دیکھنے کے لئے ضرور جاتا ہوں اور وہاں دیر تک بچپن کی یادوں میں گھرا رہتا ہوں۔خانپور والا گھر فروخت ہوا تو ابا جی کے چہرے پر کوئی اداسی نہ تھی۔یوں ان کے اندر کا آریا فتح یاب ہو گیا۔مگر دراوڑ مغلوب کہاں ہوا؟ اُس نے بیوی بچوں کو دھرتی کا متبادل بنا لیا۔ایک معمولی سی مدت کے علاوہ بیوی بچوں کو خود سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔

اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ ابا جی کے اندر موجود رہا۔یہ درویش خواب بین، دعا گو اور صاحبِ کشف و کرامت تھا۔عرب درویش کا کمال یہ تھا کہ نیل آرمسٹرانگ سے دس سال پہلے اُس نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ابا جی نے ۱۹۵۹ء میں خواب دیکھا کہ وہ چاند کی سرزمین پر اُترے ہوئے ہیں۔وہاں کے پہاڑ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے راکھ کے ہوں اور پاؤں رکھتے ہی راکھ میں دھنس جائیں

گے۔لیکن جب ابا جی پہاڑ پر پاؤں رکھتے ہیں تو وہ پتھر کے ہی ہوتے ہیں۔

Rain Makers اور Rain Breakers کے چند قصے تو اب پڑھنے کو ملے ہیں مگر ابا جی کی ’’وِل پاور‘‘ اور ’’ارتکاز‘‘ کا کرشمہ تو ہم نے خود دیکھا تھا۔ابا جی اور امی جی میں ’’بزرگی‘‘ کے مسئلے پر مذاق چلتا رہتا تھا۔ابا جی نے کہا: اگر میں اللہ میاں سے دعا کرکے اسی وقت بارش کرادوں تو میری بزرگی کو مان لوگی؟۔۔۔۔رحیم یار خاں میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بادلوں کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔اس لئے امی جی نے للکارتے ہوئے شرط منظور کر لی۔ابا جی مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب چھت سے نیچے آئے چاروں جانب سے گھنگور گھٹائیں اُمڈی چلی آرہی تھیں۔موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔لیکن امی نے ابا جی کی بزرگی کو نہیں ماننا تھا‘نہیں مانیں۔

مریضوں پر دَم کرنا اور کسی کی خاص غرض کے لئے خصوصی دعا کرنا ان کی روحانیت یا وِل پاور کا عام سا کرشمہ تھا۔میری ایک بہن زبیدہ کو جب بھی بخار ہوا اور دوا سے فرق نہیں پڑا‘ابا جی نے اسے بھینچ کر گلے سے لگایا اور وہ ٹھیک ہوگئی۔میرے نزدیک ایسے متعدد واقعات کے باوجود ابا جی کی زندگی کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے دُکھوں سے بھری ہوئی زندگی کو ہنسی خوشی گزار لیا۔کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلر ماسٹر تک کا تکلیف دہ سفر طے کیا ۔پھر شوگر مل میں نوکری کر لی اور مجھے بھی شوگر مل میں جھونک دیا۔حبیؔ سنز شوگر ملز خانپور کے جنرل منیجر عزیز حسین کی بیگم بڑی نیک دل خاتون تھیں (اگر ابھی تک زندہ ہیں تو اللہ انہیں مزید زندگی عطا کرے)۔ابا جی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔اپنے بہت سے خانگی معاملات ابا جی کو بتا کر ’’دعا‘‘ اور ’’دوا‘‘ دونوں کے لئے کہتیں۔بیگم عزیز حسین کی نیکی کے سبب مجھے پندرہ برس کی عمر میں شوگر مل میں نوکری مل گئی۔میں نے اپنی زندگی کے بے حد قیمتی اُنیس سال اس شوگر مل میں برباد کئے۔بیگم عزیز حسین کی نیک نیتی اور نیکی کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے لئے نیکی نہ کی ہوتی تو میں زیادہ بہتر حالت میں ہوتا۔شوگر مل کی ملازمت کے حوالے سے ہی یاد آیا کہ ملز انتظامیہ کے مزدور دشمن رویے کے باعث مجھے ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑا۔ملز میں تصادم ہوا۔ بعض اہم افسروں کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوئی۔مقدمات بنے۔اس دوران مجھے دھمکیوں کے ساتھ بعض خوشنما آفرز بھی ہوئیں مگر میں جوشِ جوانی اور بغاوت کی دُھن میں ہر آفر کو ٹھکراتا چلا گیا۔ایک مرحلے پر ابا جی سے بھی کہا گیا کہ مجھے مفاہمت کے لئے راضی کریں۔ابا جی نے مجھے بتایا کہ مجھے اس طرح کہا گیا ہے مگر تم جو فیصلہ اپنے طور پر کرنا چاہو وُہی کرو۔میں نے کہا کہ اگر آپ مفاہمت کا حکم دیتے ہیں تو میں تیار ہوں۔مگر انہوں نے کہا میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گا۔تم خود فیصلہ کرو گے اور جو بھی فیصلہ کرو گے وہی درست ہوگا۔چنانچہ میں نے مفاہمت کی بجائے بغاوت کا فیصلہ کیا۔اس واقعہ سے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ابا جی اپنی وضع داری کی روایت پر تو قائم تھے مگر میرے باغیانہ رویے کو وہ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے۔اسی لئے مجھے اس سے روکنے کے بجائے انہوں نے بالواسطہ طور پر میری حوصلہ افزائی کی۔جب ہماری یونین کو معطل کرادیا گیا تب ہم سے ملنے والے ہر مزدور سے باز پرس کی جاتی تھی۔مگر ابا جی کی اپنی شخصیت اتنی مضبوط تھی کہ نہ صرف انہیں ملز انتظامیہ کی طرف سے تنگ نہیں کیا گیا بلکہ اُن کا اسی طرح احترام کیا جاتا رہا جیسا میری بغاوت سے پہلے ہوتا تھا۔

ابا جی بتاتے تھے کہ ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بیٹوں کی کمی چلی آرہی تھی۔ایک بزرگ کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ان بیٹوں میں سے ایک کا ہاں اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ان میں سے بھی ایک کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔۔۔۔میاں میر محمد کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔میاں سعید بے اولاد رہے۔میاں غوث محمد کے ہاں ایک بیٹا ہوا مگر اگلے مرحلے میں ان کی نسل بھی ختم ہو گئی۔میاں اللہ رکھا کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔بابا جی اور ابا جی۔۔۔بابا جی کے ہاں بھی اولاد نہ ہوئی اور ابا جی!

ابا جی نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی عزیز بی بی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لی کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔۔۔۔پھر ابا جی کی شادی ہماری امی جی سے ہوئی اور یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔پانچ بیٹے‘ پانچ بیٹیاں۔۔۔عزیز بی بی نے دوسری جگہ شادی کر لی مگر اولاد سے محروم رہی۔

ایک دفعہ بُوا حیات خاتوں ہماری چھوٹی بہن بے بی کو لے کر ایک رشتہ دار کے یہاں گئیں۔وہیں ابا جی کی پہلی بیوی آ گئی۔بے بی کو دیکھتے ہی چونکی۔اس کے استفسار پر بُوا حیات خاتوں نے بتایا کہ قریشی غلام سرور کی بیٹی ہے۔اسی وقت بے بی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ابا جی کی اولاد کی تفصیل پوچھی۔بوا حیات خاتوں نے تفصیل بتا دی۔سُن کر سارے بچوں کو درازیٔ عمر کی دعائیں دینے لگی اور پھر حسرت سے کہنے لگی مجھے میری زیادتی کی سزا مل گئی ہے۔چند دنوں کے بعد ابا جی کی پہلی بیوی کی طرف سے کھانے کی چند اشیاء کا تحفہ ہمارے گھر آیا۔مگر ابا جی نے ساری چیزیں تلف کرادیں۔کسی کو چکھنے نہیں دیں۔ان کا خیال تھا کہ ان اشیاء پر کوئی منفی قسم کا دَم کیا گیا ہے۔۔۔پہلی بیوی کی بے وفائی کے بعد ابا جی کی امی جی سے شادی ہوئی تو دونوں کی عمروں میں بارہ سال سے زائد کا فرق تھا۔مگر اس بُعد نے محبت میں اضافہ کیا۔ابا جی اور امی جی کی محبت اور خوشگوار ازدواجی زندگی سارے خاندان کے لئے آج بھی ایک مثال ہے۔ایک وقت تھا کہ ہمارے عزیزوں میں ابا جی کا گھر سب سے زیادہ خوش حال تھا‘ پھر وہ وقت آیا کہ ابا جی کا گھر انتہائی غربت کا شکار ہوگیا۔بے حد قریب رہنے والے عزیز دور ہوگئے مگر

ابا جی کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ابا جی بے حد قناعت پسند تھے لیکن انہوں نے ہمیں کبھی قناعت کا درس نہیں دیا۔دراصل وہ اس لئے سارے دُکھ خوشی خوشی برداشت کر رہے تھے کہ پچھلی کئی پشتوں سے ''پُل صراط'' پر چلتے ہوئے ان کے خاندان کو پانچ بیٹوں کا سنبھالا مل گیا تھا۔حالانکہ یہ پانچوں بیٹے ان کے کسی کام نہ آسکے۔نہ کوئی خدمت کرنے کا اہل ہو سکا' نہ کوئی خدمت کر سکا۔ان کی اپنی ساری زندگی ہی مشقت کرتے گزر گئی۔

ابا جی کو کبھی کبھار غصہ بھی آتا اور یہ غصہ عام طور پر گھر کے گھڑوں اور برتنوں پر اُترتا تھا۔لیکن جب شام کو ابا جی گھر آتے ان کے ایک ہاتھ میں نیا گھڑا ہوتا اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کے ہار ہوتے اور جھگڑا ختم۔

۱۹۵۰ء میں ابا جی اچانک بیمار ہوئے تھے۔اس علالت کی حالت میں عجیب وغریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔ بابا جی کے بیان کے مطابق ابا جی کو چار چار' پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر ابا جی اس طرح اُٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ابا جی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا' اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا' حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ابا جی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہو گیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ٹانگوں سے جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید (۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔ابا جی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری' جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا' میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی' دَم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس ہوتا ہے۔واللہ اعلم!

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ابا جی نے یکے بعد دیگرے دو خواب دیکھے تھے۔پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ابا جی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔یہ خواب سُن کر ابا جی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ابا جی نے اپنے مُرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرمادیں۔مُرشد کو ابا جی کے خواب کا علم نہیں تھا۔انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔مگر ابا جی کے خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دُور دُور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔شاید حسنِ اتفاق تھا کہ میں پیدا ہو گیا اور حیدر نام رکھا گیا۔

میں بچپن میں شرارتیں بہت کرتا تھا۔دوسروں کو ڈرانے میں مزہ آتا تھا۔اسی وجہ سے بچپن میں ابا جی سے بڑی مار کھائی۔سب سے زیادہ مار بھی میں نے کھائی اور ابا جی کی توجہ بھی سب سے زیادہ مجھے ملی۔یہ ابا جی کی ذاتی توجہ ہی تھی جس کے باعث اسکول میں داخلہ کے وقت مجھے کچی پکی کی بجائے براہِ راست دوسری جماعت میں داخل کر لیا گیا۔شادی کے بعد بھی ایک دفعہ ابا جی سے تھپڑ کھایا۔یوں تو والدین کی محبت ساری اولاد کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ابا جی کو آپی سے اور مجھ سے سب سے زیادہ پیار تھا۔زبیدہ کے لئے فکرمندی زیادہ رہی۔جبکہ اعجاز سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا رہا۔

موسیقی سے ابا جی کو رغبت نہیں تھی لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ایک پرانا گانا ''ڈاچی والیا موڑ مہار وے'' سُن کر کہتے یہ تمہارے دادا کو بہت پسند تھا۔ابا جی کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں پسند تھیں۔عام طور پر تحت اللفظ کے ساتھ پڑھتے۔کبھی کبھار اپنے آپ میں گنگنا بھی لیتے۔عنایت حسین بھٹی کی آواز میں خواجہ صاحب کی کافی ''ساکوں سجناں دے ملن دی تانگ اے'' سُن کر جھوم سے اُٹھتے۔انہیں کی وجہ سے ہی شاید مجھے لوک گیتوں اور صوفیانہ شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ایک ہلکی سی مسکراہٹ عموماً ابا جی کے چہرے پر رہتی تھی۔جملے باز نہیں تھے مگر اچھے جملے پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ہنسی کی کسی بات پر اگر کھل کر ہنستے تو اتنا ہنستے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ان کی اس کیفیت پر میراؔجی کا شعر یاد آ گیا ہے

نہیں گریہ و خنداں میں فرق کچھ بھی
جو ہنستا گیا دل تو روتا گیا دل

ابا جی کی شخصیت کا جادو ایسا تھا کہ آج بھی رحیم یار خاں کے ان کے پرانے احباب سے ان کا ذکر کریں تو ان کے باتیں سناتے سناتے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔رحیم یار خاں کے پرانے محلے سے جا کر پتہ کریں تو ابا جی کا نام سنتے ہی ان کے چہروں پر محبت کی چمک آجاتی ہے۔

میں تقریباً دس سال کے بعد پہلی دفعہ پرانا مکان دیکھنے گیا تو نہ صرف اڑوس پڑوس کے سارے لوگ جمع ہو گئے بلکہ اتنی محبت سے اپنے گھروں میں لے گئے کہ میں ان محبتوں پر حیران رہ گیا۔گھر کی لڑکیوں' عورتوں میں سے کسی نے پردہ نہ کیا۔بوڑھیوں نے سر منہ چوم لیا۔یہ ساری محبتیں حقیقتاً ابا جی کے وسیلے سے نصیب ہوئیں۔شوگر مل میں آج بھی ان کی بات کی جائے تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو شرارتاً ہی ان کے کردار پر انگلی اُٹھا سکے۔دراصل ابا جی صراطِ مستقیمی آدمی تھے۔ایسا بننے کے لئے کٹھن ریاضت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔میں بھی صراط مستقیمی بننے کی کوشش کرتا ہوں مگر زگ زیگ چلتا ہوں کیونکہ مجھے احساس رہتا ہے کہ لکیریں اپنے فقیروں کو کھا

جاتی ہیں۔

شروع میں ابا جی کے ساتھ تعلق میں احترام کے باعث ایک حجاب یا فاصلہ سا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ کم ہوتا گیا۔یکسر ختم تو نہیں ہوا مگر ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ہوگئی کہ انسانی زندگی کے بعض حساس موضوعات پر ہم اطمینان سے گفتگو کر لیتے تھے۔بعض مسائل میں انہوں نے میری رہنمائی بھی کی۔میرے مقابلے میں ابا جی اپنے پوتوں سے زیادہ بے تکلف تھے۔زلفی،شازی،ٹیپو،تینوں ان کے ساتھ فری تھے۔ابا جی ان سے مختلف گیمز کھیلتے،مزے سے ہارتے اور پھر پوتوں کی بے تکلف ہوٹنگ سے لطف اندوز ہوتے۔پہلے پہل جب میں نے شازی کو ہوٹنگ کرتے دیکھا تو اس کی بدتمیزی کو محسوس کرتے ہوئے اسے سختی سے ڈانٹا مگر اُسی وقت ابا جی کی جوابی ڈانٹ مجھے پڑی کہ جیسے کرتے ہیں کرنے دو۔۔۔تو میں نے دادا پوتوں کی بے تکلفی سے خود کو الگ کر لیا۔

علالت کی حالت میں ابا جی بار بار مجھے اور آپی کو یاد کرتے رہے۔آپی نے کراچی میں کوئی خواب دیکھا اور گھبرا کر از خود ابا جی کے پاس پہنچ گئی۔ابا جی نے آپی کو گلے سے لگا لیا۔دیر تک روتے رہے اور پھر کومے کی حالت میں چلے گئے۔جب میں پہنچا کومے کی حالت میں تھے۔باقی بہن بھائی بھی جمع ہونے لگے۔شاہدہ،بے بی،اکبر،طاہر،اعجاز سب آ گئے۔زبیدہ امریکہ میں تھی۔اس کا آنا ممکن نہ تھا۔نوید نے آنے میں تھوڑی دیر کر دی۔نوید آ گیا تو پانچوں بیٹے باپ کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔باری باری سب نے سامنے آ کر اپنا نام لیا۔ہر آواز پر ابا جی نے آنکھیں کھولیں اور ان کی آنکھوں میں غروب ہوتے ہوئے زندگی کے سورج نے ہر بیٹے،بیٹی اور عزیز کو خدا حافظ کہا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئے۔

ابا جی کی وفات کے بعد ایک دوست نے تعزیتی خط میں لکھا کہ میں جب بھی خانپور میں قیام کے دنوں میں آپ کے گھر پر دستک دیتا،اگر آپ کے ابا جی آتے اور میں آپ کا نام پوچھتا تو آپ کا نام سنتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔رحیم یار خاں کے قریب ایک گاؤں ''بستی قندھارا سنگھ'' کی ایک فیملی سے ہمارے رشتہ داروں جیسے تعلقات ہیں۔ابا جی کی وفات کے بعد خالہ فاطمہ وہاں سے تعزیت کے لئے آئیں تو انہوں نے بتایا کہ ان کے بھائی شاہ محمد صاحب پورے خاندان سمیت بھارتی پنجاب سے سیدھے اسی گاؤں میں آئے تھے۔عید سے چند روز پہلے ابا جی کی دوکان پر گئے اور انہیں سونے کے کڑے دے کر کہنے لگے کہ انہیں گروی رکھ کر ہمیں کپڑا ادھار دے دیں تاکہ بچوں کی عید ہو جائے۔ابا جی ان کی پسند کے مطابق کپڑا دیتے چلے گئے۔جب ان کا مطلوبہ سارا کپڑا دے دیا تو ابا جی نے سیف سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور شاہ محمد صاحب سے کہا یہ میری طرف سے آپ کے بچوں کے لئے عیدی ہے۔سونے کے کڑے واپس لے جائیے اور کپڑوں کی رقم جب سہولت کے ساتھ دے سکیں دے جائیے۔۔۔کسی شناسائی کے بغیر اس سلوک پر شاہ محمد صاحب پہلے حیران ہوئے اور پھر آبدیدہ ہوگئے۔نتیجۃً ان کے خاندان کے افراد سے آج بھی ایسا گہرا تعلق بنا ہوا ہے جو بعض رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔البتہ خالہ فاطمہ کے اس انکشاف کے بعد مجھے یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ ابا جی کا اچھا بھلا کپڑے کا کاروبار زوال کا شکار کیوں ہوا۔

ابا جی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میّت کو سر سے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا اور پھولوں سمیت ہی دفن کیا تھا۔وفات کے تیسویں دن،رات نو بجے کے بعد اُس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اُٹھنے لگیں جو ابا جی کا ذاتی کمرہ تھا۔یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔میں نے انہیں بھی کمرے میں بلا لیا۔انہوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آ کر محسوس کیا اور پھر آوازیں دے کر سارے افراد خانہ کو جمع کر لیا۔سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔دونوں دفعہ خوشبو کا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہا ہو۔۔۔بابا جی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملے میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمہیں ملتی رہتی۔شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رُونما ہو جاتا۔مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کر لیا ہے۔۔۔بابا جی کی باتیں بابا جی جانیں۔۔۔لیکن یہ خوشبو کیا تھی؟ اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے۔

> حیدر قریشی کی ادبی حیثیت کے کئی پہلو ہیں۔اتنی رنگا رنگی کم ہی شخصیتوں میں پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری، تنقید،افسانے اور خاکے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ خاکہ نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔اس دلنشیں انداز میں انہوں نے شخصیات کے،واقعات کے،ماحول کے اور قصوں کے قلمی نقشے تراشے ہیں کہ قاری ان کے سحر میں گم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔**سلطانہ مہر**
>
> (بحوالہ تذکرہ ''گفتنی'' حصہ اوّل صفحہ نمبر ۲۰۴،مطبوعہ مہر بک فاؤنڈیشن لاس انجلس،امریکہ)

پسلی کی ٹیڑھ

(مبارکہ)

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

بیوی۔۔ بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ بہر حال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ سچ لکھوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔ اللہ میری حفاظت فرمائے۔ (آمین)

مبارکہ میری ماموں زاد ہے۔ میں غالباً چھ سال کا تھا، مبارکہ دو سال کی تھی۔ ہمارے بیشتر رشتہ دار ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ کسی تقریب کے باعث اور بہت سارے عزیز بھی جمع تھے۔ بڑی ممانی نے لاڈ سے پوچھا فلاں سے شادی کروگے؟ میں نے صاف انکار کر دیا۔ پھر پوچھا گیا کس سے شادی کروگے؟۔۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مبارکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کے ساتھ کروں گا۔ شاید بڑی ممانی کو میری پسند پر کوئی اعتراض تھا یا اپنی تجویز رد کئے جانے کا افسوس، فوراً بولیں: ''ہم ریاستیوں (سرائیکیوں) کو ایک رشتہ دے کر ہی بھولے ہیں۔ اور کسی ریاستی کو اب رشتہ نہیں دینا''۔۔ اس کا جواب مجھے اپنی یادداشت میں کہیں نہیں ملتا البتہ خاندان میں بڑی مستحکم روایت موجود ہے کہ میں نے جواباً کہا تھا: اگر آپ مبارکہ سے شادی نہیں کروگے تو جب یہ روٹیاں پکا رہی ہوگی جیپ لے کر آؤں گا اور اسے اس میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔۔ ماموں ناصر جو پاس ہی بیٹھے تھے، میرا جواب سن کر بڑی ملائمت سے بولے: بیٹا! تم شرافت سے آنا میں خود ہی تمہیں بیٹی دے دوں گا۔

بچپن میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی مذاق کی ایک بات اتنی سنجیدگی اختیار کر گئی کہ اب وہ سارا مذاق وجدانی معلوم ہوتا ہے۔ ممانی مجیدہ فوت ہو گئیں تو ماموں ناصر کے لئے بچوں کو سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق خود ہی رشتے کا انتظام کر دیا۔ یعنی اس زبانی مذاق کے ٹھیک بارہ سال بعد ہمارے ساتھ عملی مذاق ہو گیا۔ میں اٹھارہ سال کا تھا، مبارکہ چودہ سال کی تھی جب ہماری شادی ہو گئی۔ ہماری شادی کیا تھی گڈی، گڈے کا بیاہ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہ اسے کچھ خبر! بے خبری کے عالم میں ولیمہ بھی ہو گیا۔ کئی دن گزر گئے اور ہم بے خبری کی جنت میں سوتے رہے۔ پھر یکایک، از خود آگہی کا کوندا لپکا۔ اور پھر ہم پتوں سے اپنے تن ڈھانپنے لگے۔ آدم اور حوا کی کہانی آگے بڑھنے لگی۔

بچپن کے اس واقعہ کے حوالے سے میں نے ایک دفعہ مبارکہ سے کہا: بچپن کی معمولی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملی ہے۔۔ اس نے فوراً کہا: غلطی آپ کی تھی، سزا میں بھگت رہی ہوں۔۔ خیر بات ہو رہی تھی آدم اور حوا کی کہانی کی۔ اس کہانی میں اتوار کے دن کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں اتوار کے دن پیدا ہوا، مبارکہ بھی اتوار کے دن پیدا ہوئی، ہمارا نکاح بھی اتوار کے دن ہوا۔ پہلی بیٹی رضوانہ اتوار کے دن پیدا ہوئی۔ پہلا بیٹا شعیب اتوار کے دن پیدا ہوا۔ آخر حکومت پاکستان نے تنگ آ کر اتوار کی سرکاری چھٹی ختم کر دی اور چھٹی کے لئے جمعہ کا دن مقرر کر دیا۔

لڑکپن کے دو سال ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ پتہ نہیں یہ بچپن کی نامزدگی اور لڑکپن کی انڈر سٹینڈنگ تھی یا کچھ اور۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس بن گئے۔ پھر بات مزاج شناسی سے بڑھ کر محبت اور دوستی کی سطح تک پہنچی اور وہاں سے بھی آگے بڑھی تو اس مقام کے بیان کے لئے کوئی لفظ نہیں ملا۔ بیوی دوستی اور محبت۔۔ یہ سارے مقدس رشتے اب مبارکہ کے سامنے چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ (خدا کرے مبارکہ پر اس جملے کا کچھ اثر ہو)

میں نے کتابی سلسلہ ''جدید ادب'' جاری کیا۔ اس میں مبارکہ کی تمناؤں کا لہو شامل تھا۔ ہر شمارے کے ساتھ اس کا ایک آدھ زیور بک جاتا۔ اس اللہ کی بندی نے ایک دفعہ بھی تکرار نہیں کی۔ جب تک اس کا زیور ساتھ دیتا رہا ''جدید ادب'' جاری رہا۔ زیور ختم ہو گئے تو ''جدید ادب'' بھی بند ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ لیکن مبارکہ نے بھی تو میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ میرے اچھے برے ہر طرح کے کاموں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ کسی نازک موڑ پر آ کر اگر ساتھ دینا ممکن نہیں رہا تو اس نے کنارے پر کھڑے ہو کر نظارہ کیا مگر مجھے دباؤ ڈال کر روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اس طرزِ عمل نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ میری ''گمراہیاں'' اسے معلوم ہیں میرے ''گناہ'' اس کے علم میں ہیں لیکن مجال ہے اس نے کبھی مجھے شرمندگی کا ہلکا سا احساس بھی دلایا ہو۔

امی جی اور مبارکہ میں گہری انڈر سٹینڈنگ تھی۔ ساس بہو میں کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوتی مگر ایسی نہیں جس میں ابا جی کو یا مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جلدی ہی ساس، بہو کی جگہ پھوپھی، بھتیجی آگے آ جاتیں اور خود ہی سارا

معاملہ سنبھال لیتیں۔آخردم تک امی جی اور مبارکہ ایک ساتھ رہیں،صرف ایک سال کا عرصہ دونوں کو الگ رہنا پڑا کیونکہ خانپور چھوڑ کر ابا جی اور امی جی نے بالائی پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ملازمت کے باعث ہم شوگر ملز کی کالونی میں شفٹ ہو گئے تھے۔اس ایک سال کے عرصہ میں بھی مبارکہ،امی جی سے ملنے کے لئے دو دفعہ گئی۔۔اسی دوران ابا جی وفات پا گئے۔شدید صدمے کا اثر زائل ہونے لگا تو سارے عزیز اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔اکبر اور طاہر بھی امی جی سے اجازت لئے بغیر اپنی بیگمات کے ساتھ رخصت ہو گئے۔جاتے جاتے امی سے اتنا کہہ گئے کہ عدت پوری کر کے ہمارے ہاں آجایئے گا۔مبارکہ جانتی تھی کہ امی جی اس طرح تو کسی بیٹے کے پاس بھی نہیں جائیں گی۔اس نے مجھے الگ کر کے سارے صورتحال سے آگاہ کر کے کہا میں ایسی حالت میں پھوپھی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی۔آپ جا کر بچوں کے سکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ بھجوادیں۔میں اب پھوپھی کے پاس ہی رہوں گی۔چنانچہ پھر مبارکہ اور بچے امی جی کے پاس ہی رک گئے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میاں بیوی میں محبت بہت زیادہ ہو تو دونوں کے چہروں ک شباہت یکساں ہو جاتی ہے۔فیض اور ایلس کی تصویریں دیکھ کر یہ بات سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔میرا خیال ہے میری اور مبارکہ کی شکلوں میں بھی کچھ ایسا تغیر رونما ہو رہا ہے۔''من تو شدم تو من شدی'' کی حد تک تو محبت ٹھیک تھی لیکن جب اس مقام سے آگے بڑھی تو پھر دونوں کی شکلیں بگڑنے لگیں اور بگڑتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم''۔۔۔۔۔۔اچھی بھلی شکلیں بگڑ گئیں مگر ہماری محبت کی شدت تو ثابت ہو گئی۔

میں اپنی فکری آزادہ روی کے باعث مبارکہ کے لئے بہت تکلیف کے سامان پیدا کر بیٹھا۔مذہبی تعصّب رکھنے والے عزیزوں نے طوفان اٹھالیا۔مبارکہ دوہرے عذاب میں تھی۔اپنی سوسائٹی کو چھوڑنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا اور مجھ سے علیحدگی کا بھی وہ سوچ نہیں سکتی تھی۔میرا خیال ہے انسان کی مظلومیت بجائے خود ایک طرح کا مقام ولایت ہے۔مبارکہ مظلومیت کی حالت میں تھی۔محلے کی ایک پردھان عورت نے کہا: مبارکہ کو حیدر سے طلاق لے لینی چاہیئے۔۔چند ماہ کے اندر اسی عورت کی اپنی نو بیاہتا لیڈی ڈاکٹر بیٹی کو طلاق ہو گئی۔ہمارے ایک ''بزرگ'' نے امریکہ سے دباؤ ڈالا اور میرے ساتھ مبارکہ کے سماجی بائیکاٹ کا حکم صادر کر دیا۔حکم نامے کے ایک ماہ کے اندر ان کے اپنے خاندان میں بیٹے بہو میں پھوٹ پڑ گئی جو بالآخر دونوں میں علیحدگی پر منتج ہوئی۔اسے مکافاتِ عمل کہیئے۔نظامِ فطرت کہیئے یا مظلوم پر جبر کا انجام۔رہے نام اللہ کا!

مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔رضوانہ کو دیکھ کر عام طور پر ناواقف خواتین یہی سمجھتی ہیں کہ مبارکہ کی چھوٹی بہن یا نند ہو گی مگر جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی بڑی بیٹی ہے تو حیران ہوتی ہیں۔ماں بیٹی میں صرف ساڑھے سولہ سال کا فرق ہے جبکہ میرے سب سے چھوٹے بھائی اعجاز اور میری عمر میں انیس سال کا فرق ہے۔(پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے)۔اپنے پانچوں بچوں رضوانہ،شعیب،عثمان،طارق اور درِ ثمین کے ساتھ مبارکہ نے دوستی کر رکھی ہے۔ماں والی دھونس نہیں جماتی البتہ دوستانہ دھونس ضرور جما لیتی ہے۔

کسی کی شادی ہو۔۔مبارکہ شادی بیاہ کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔جب لڑکی کی رخصتی کا وقت آتا ہے دلہن سے زیادہ اس کے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔میں اس کی اس رقیق القلبی سے خاصا تنگ تھا۔خدا بھلا کرے ماموں سمیع کی بڑی بیٹی نوشی کا۔۔نوشی کی رخصتی ہونے لگی تو ممانی راشدہ پرسکون تھیں۔چھوٹی بہنیں مطمئن۔مگر ان کی کزن مبارکہ بیگم حسب معمول رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔اتفاق سے میری نظر نوشی کی طرف اٹھ گئی۔دولہا کے ساتھ گھر سے باہر آتے ہوئے بی بی مسکرا رہی تھی۔۔گاڑیاں رخصت ہوتے ہی میں نے مبارکہ بیگم کو پکڑ لیا۔یہ کیا شرافت ہے۔جس کی شادی ہے وہ مسکرا رہی ہے۔اس کی ماں بہنوں کے چہروں پر اطمینان ہے اور آنجناب رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔اللہ اس کا بھلا کرے کہ تب سے اس نے شادی بیاہوں پر رونے دھونے کا سلسلہ فی الحال ترک کر دیا ہے۔(فی الحال اس لئے کہ اپنی بیٹیوں کی شادی پر وہ ساری کسر نکالے گی ☆)

مبارکہ کو مشرقی پنجاب سے غائبانہ انسیت ہے۔اس کی ظاہر وجہ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے کئی برس بعد ممانی مجیدہ ہندوستان گئیں تو وہیں مبارکہ کی پیدائش ہو گئی۔ممانی مجیدہ سے ہی اسے معلوم ہوا کہ ان کی زچگی کرانے والی خاتون کا نام پیاری دیوی تھا۔سو اسے مشرقی پنجاب سے بھی ایک لگاؤ ہے اور ''پیاری دیوی'' نام بھی بہت پیارا لگتا ہے۔اس انسیت کی بعض لاشعوری وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔مثلاً مبارکہ کے ددھیال،ننھیال سب مشرقی پنجاب سے پاکستان آئے تھے اور کئی جانوں کا نذرانہ دے کر پاکستان پہنچ پائے تھے۔ہو سکتا ہے آباؤ اجداد کی سرزمین سے اسے لاشعوری طور پر محبت ہو۔پھر مبارکہ ذات کے لحاظ سے باجوہ ہے جو جاٹوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے۔پانچویں چھٹی پشت سے یہ لوگ سکھ تھے۔اب جو مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک چل رہی ہے ممکن ہے مبارکہ کے اندر کی چھپی ہوئی سکھنی کو مشرقی پنجاب کی موجودہ حالت کے باعث بھی اس علاقے سے انسیت محسوس ہوتی ہو۔۱۹۸۷ء میں ہم بھارت گئے تو مبارکہ کی شدید خواہش تھی کہ مشرقی پنجاب کے علاقے دیکھے جائیں مگر دہلی میں بعض دوستوں نے سمجھایا کہ وہاں کے حالات بے حد خراب ہیں۔ایک دوست نے کہا ویزہ میں کل لگوا دیتا ہوں مگر آپ لوگوں کو ادھر جانے نہیں دوں گا۔دراصل انہیں دنوں میں پنجاب میں ایک بس روک کر اس کے تمام مسافروں کو بغیر کسی تخصیص کے ہلاک کر دیا تھا۔اسی وجہ سے دلی کی دوستوں نے ہمیں مشرقی پنجاب نہیں

جانے دیا اور اس علاقے کو دیکھنے کی مبارکہ کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

میری شاعری کو اس کے پورے پس منظر کے ساتھ جاننے والی واحد قاری مبارکہ ہے۔ اسے علم ہے کہ میری کون سی غزل یا نظم کب کہی گئی اور کیوں کہی گئی۔۔ اسے یہ بھی علم ہے کہ میں کس کس کو یہ باور کرا چکا ہوں کہ فلاں غزل درحقیقت آپ کے لئے کہی گئی اور یہ بھی علم ہے کہ اصلاً کس کے لئے کہی گئی۔ میری شاعری سے باہر کے اس سارے کھیل تماشے کو مبارکہ نے مزے لے کر دیکھا ہے۔ میری دوستوں سے اس نے کبھی خار نہیں کھائی، الٹا محبت کی۔ ایک دفعہ میری ایک بہت اچھی دوست نے مبارکہ کی موجودگی میں بتایا کہ ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے ایک ماہر نے بتایا ہے کہ تمہاری شادی کسی میرڈ Married سے ہوگی۔ کوئی اور شاعر ہوتا تو اس کی بیوی نے جو طوفان اٹھایا ہوتا اس کی لہریں اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں تک پہنچتیں مگر مبارکہ نے زوردار قہقہے میں ساری بات اڑا دی۔ ایک دفعہ بعض عزیزوں نے اسے سمجھایا کہ مرد کا اتنا اعتبار کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا (گویا تھوڑا بہت شک کرتے رہنا چاہیے) مگر مبارکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جھلا کر ایک عزیز نے یہاں تک کہہ دیا: اب تمہاری آنکھیں اسی وقت کھلیں گی جب وہ بچوں سے بھرا ٹوکرا لے کر گھر آئے گا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے مبارکہ کے اندر وہی دو سال کی بچی بیٹھی ہے جسے دیکھ کر میں نے کہا تھا اسی کے ساتھ شادی کروں گا۔ معصوم، بھالی بھالی ایسے کبوتر (بلکہ کبوتری) کی طرح جو بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے اور خود کو محفوظ سمجھ لے۔ مگر نہیں۔۔ مبارکہ نے تو آنکھیں بھی ہمیشہ کھلی رکھی ہیں اور بلیوں کو دیکھ کر بھی خود کو محفوظ سمجھتی رہی ہے۔ قدرت خدا کی۔ ہر خطرے سے محفوظ بھی گزر جاتی رہی ہے۔ ہر چند اس میں خدا کی قدرت کے ساتھ میری شرافت کا بھی دخل ہے۔

ایک دفعہ میں نے مبارکہ سے پوچھا: تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد کیوں ہے؟

''اعتماد''؟۔۔ مبارکہ نے حیرت سے پوچھا اور پھر رواں ہوگئی ''تمہارے ساتھ شادی کون کرے گی؟ کس کا دماغ خراب ہے؟ شکر کرو کہ میں مل گئی ہوں اور وہ بھی اس لئے کہ تمہارے ماموں کی بیٹی ہوں'' ان جملوں سے ہمارے درمیان پائی جانے والی (یک طرفہ) بے تکلفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرأت نہیں۔ اس خاکے کا دوسرا حصہ مبارکہ کی وفات کے بعد لکھوں یا میری وفات کے بعد وہ لکھے گی۔ (وماتوفیقی الا باللہ)

☆ رضوانہ کی شادی پر ساری کسر نکال دی ہے۔ جزاک اللہ

اطاعت گزاری

آخر لکیر اپنے فقیروں کو کھا گئی
بس اک فقیر بچ گیا ہٹ کر لکیر سے

میرے ایک جوشیلے لیکن کم فہم دوست کا خیال ہے کہ اطاعت کا مادہ افراد اور قوموں کو فکری لحاظ سے بانجھ اور اپاہج بنا دیتا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ غلامی کی قدیم روایت نے آج کے مہذب دور میں اطاعت گزاری کی مہذّب صورت اختیار کر لی ہے۔ اطاعت گزاری کو ایک اعلیٰ خوبی کے طور پر پیش کر کے افراد اور قوموں کو اس کے جال میں پھنسا کر غلام بنایا جاتا ہے۔ میں نے اس وقت تو دوست کی بات میں بڑا وزن محسوس کیا لیکن بعد میں جب غور کیا تو مجھ پر لمحہ بہ لمحہ اطاعت گزاری کی برکات منکشف ہوتی گئیں۔

عام حالات میں اطاعت گزاری کا مادہ ہزار نعمت کے برابر ہے جبکہ تنگ دستی کی حالت میں تو لاکھ نعمت سے بھی بڑھ کر ہے۔ سچے اطاعت گزار اپنے آقا یا ممدوح کی بات کبھی رد نہیں کرتے خواہ ظاہراً وہ بات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ ظاہر بین نہیں بلکہ باطن بین ہوتے ہیں۔ اپنے اندر کی تیز فراست کے باعث انہیں یہ بھید معلوم ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ کسی سورج یا چاند کے نہیں، اپنے آقا کے اطاعت گزار ہیں۔

اطاعت گزاری، فرماں برداری اور وفا شعاری ایک ہی حقیقت کے مختلف چہرے ہیں۔ اطاعت کا مادہ انسانی نفس کو سنگسار کر کے اس کی روح اور ذہن کو ہر طرح سے سبکسار کر دیتا ہے، گویا اطاعت سے مراحلِ تصوّف کا آغاز ہوتا ہے اور کمال اطاعت تک وہ کامل صوفی بن جاتا ہے۔ دنیا کی لعنت ملامت یا اپنے ضمیر کی طعنہ زنی اسے اطاعت سے نہیں روک سکتی۔ کوئی عاشق اس وقت تک سچا اور کامیاب عاشق نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی وفا کے جوہر کو محبوب کی کامل اطاعت کے مقام تک نہ پہنچا دے۔ اسی لئے سچا عاشق اطاعت کی ایک ہی جست سے عشق کے سارے مرحلے طے کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔

تجریدی تصویر کی طرح اطاعت گزاری بھی تہ در تہ نتائج (معانی) کی حامل ہے۔ آپ نے بڑے افسر کی اطاعت کی تو اس کے منظورِ نظر بن گئے۔ بڑے افسر کے منظورِ نظر بنتے ہی ماتحت عملہ کے اطاعت گزاروں کی ایک فوج آپ کے زیرِ نگیں آ گئی۔ گویا افسروں کی اطاعت کرنے والوں کو بھی ایک افسری نصیب ہو جاتی ہے۔ آمروں کی اطاعت کرنے والوں کو اسی طرح ایک قسم کی آمریت مل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک مسلسل جاری وساری رہتا ہے۔ اطاعت گزاری ایک طرف حاکمِ اعلیٰ کے دل میں اطاعت گزار کے لئے محبت اور ہمدردی کے ساتھ نرم گوشہ پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف اس اطاعت گزار کی اطاعت پر کمربستہ ہو جانے والے ماتحتوں کے دل میں بھی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ یوں اطاعت گزاری کے نتیجے میں دنیا امن اور محبت کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تمام جماعتیں جو دُنیا کو امن اور محبت کا گہوارہ بنانے پر تُلی ہوئی ہیں، سب سے زیادہ زور اپنی تنظیم کی اطاعت پر ہی دیتی ہیں۔ سچے اور کامل اطاعت گزار ایسی جماعتوں کے لئے روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب بھی کوئی فرد یا چھوٹا سا گروہ ایسی کسی جماعت سے انحراف کرنے لگتا ہے تو جماعت کے سب چھوٹے بڑے اسے کچا چبا ڈالنے پر تُل جاتے ہیں اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک اسے تہ تیغ نہیں کر دیتے یا پھر سے اطاعت پر مجبور نہیں کر دیتے۔ ایسے نازک موقع پر اخلاقیات کے سارے اصول بالائے طاق بھی رکھ دیئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اغماض و درگزر کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انحراف کرنے والوں کا مسئلہ پوری جماعت کی بقاء کا مسئلہ ہوتا ہے۔ منحرف ہونے والوں کا محاسبہ اور کردار کشی نہ کی جائے تو باقی اطاعت گزاروں کو اطاعت کُشی کے عمل سے کون روک سکتا ہے!

ہمارے معاشرے میں گھریلو ناچاقیوں کے باعث کئی گھروں میں طلاقیں ہو جاتی ہیں اور کئی گھر مستقل طور پر میدانِ کارزار بنے رہتے ہیں۔ ایسے گھر دراصل اطاعت کی نعمت سے محرومی کے باعث جہنم کا نقشہ بنتے ہیں۔ ساس، بہو میں سے کوئی ایک اور میاں بیوی میں سے اگر دونوں ہی اطاعت گزاری اختیار کر لیں یعنی اپنی آنکھیں ،کان اور ہونٹ پوری طرح مقفّل کر لیں تو نہ صرف ازدواجی زندگی خوشگوار اور مثالی ہو جائے گی بلکہ سارا گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

کامل اطاعت کے وصف سے محروم لوگوں کو بھیڑوں، بکریوں کے گلّوں سے سبق سیکھنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اشرف المخلوقات کا لقب تو بھیڑ بکریوں کو ملنا چاہئے جن کے ہاں سرِ تسلیم خم کرنے بلکہ قلم کرانے کا وصف پیدائشی ہوتا ہے۔

سچے اطاعت گزار کا کمال یہ ہے کہ جو سانحہ اس کے اپنے گروہ کے ساتھ گزرے اسے تو وہ خدا کی طرف سے آزمائش اور امتحان قرار دیتا ہے لیکن اگر ویسا ہی سانحہ بلکہ اس سے بھی کم تر سانحہ کسی دوسرے گروہ کو پیش آئے تو پورے ایمانی جوش وخروش کے ساتھ اسے عذابِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ کیسا صحیح رویّہ ہے!

ایں سعادت بزور بازواست

اچھا اطاعت گزار اول تو اپنے کھونٹے سے بندھے رہنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے تاہم اگر گھومنا پھرنا چاہے تو شاہی فرمان کے مطابق تین کھونٹ کے علاقوں تک ہی سفر کرتا ہے، چوتھے کھونٹ کی طرف کبھی نہیں جاتا۔ نتیجۃً آگہی کی ان ساری اذیتوں اور عذابوں سے محفوظ رہتا ہے جو ہر اُس شخص کا مقدر ہوتے ہیں جو چوتھی کھونٹ کی طرف نکل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ادب میں بھی اطاعت گزاری کے باقاعدہ سلسلے جاری ہیں۔ نظریاتی اطاعت گزاروں نے اپنے اپنے کیمپوں کو سجا رکھا ہے۔ ادبی گدی نشینوں کی ساری توقیر اطاعت گزاروں کے دم قدم سے ہے، جبکہ اطاعت گزاروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ ان کے لئے مراعات کا دروازہ ”کُھل جا سم سم“ کہے بغیر ہی کھل جاتا ہے۔ یوں اطاعت گزاری کے وصف کے باعث انہیں چوتھی کھونٹ کا سفر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور اطاعت گزار ادیب ادب میں چوتھی کھونٹ کے سفر کی ساری صعوبتوں سے محفوظ و مامون رہتے ہیں۔ سچ ہے جنہیں اللہ رکھے انہیں کون چکھے!

اطاعت گزاری کا جوہر نہ صرف بغاوت، سرکشی اور انحراف کے جذبات کو ختم کرتا ہے بلکہ انسانی ذہن کو زیادہ سوچنے کے عمل سے روک کر اسے بہت سی مشکلات سے بھی نجات بخش دیتا ہے۔ زیادہ سوچنے والے لوگ یعنی آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے والے لوگ، جب سوچتے ہیں تو بُرے بھلے میں حدِّ فاصل قائم کر کے تعصب اور آویزش کو ہوا دینے لگتے ہیں۔ سقراط اور گلیلیو ایسے ہی باغی لوگ تھے جو ہر وقت ذہن کو استعمال کرنے کی بدعادت میں مبتلا تھے۔ صبح وشام غور وفکر میں ڈوبے رہتے اور پھر اپنے باغیانہ خیالات سے اطاعت گزاروں کی نئی نسل کو بھی گمراہ کرتے۔ سب جانتے ہیں کہ ان بدبختوں کا انجام کیا ہوا۔ سچے اطاعت گزار آج بھی ان کے انجام سے عبرت پکڑتے ہیں۔

لیکن کیا واقعی؟۔

یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کیا ہے اور اب اس کا جواب سوچ رہا ہوں! ظاہر ہے جواب سوچنے کے لئے اپنا ذہن استعمال کرنا پڑے گا اور اپنے ذہن کو استعمال کرنے والوں کا انجام مجھے (خاص طور پر مجھے) اچھی طرح معلوم ہے!

تجربہ اور تجربہ کاری

چالاکی کہاں آتی تھی حیدؔر کو مری جان
بس تیری اداؤں کی کرامات سے آئی

زندگی کے تجربات اور تجربہ کاری دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زندگی کے تجربات زندگی کو معصومانہ حیرت سے دیکھنے اور پھر اس کی جستجو کے سفر سے عبارت ہیں۔ یہ حیرت اور جستجو اجتماعی نوعیت کی ہے کیونکہ اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے۔ پتھر کے زمانے سے کمپیوٹر کے زمانے تک انسانی زندگی کے تجربات کے ثمرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ جستجو کے اس سفر میں انسان اپنے ہر قدم پر حیرت میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر اسی معصومانہ حیرت کے ساتھ جستجو کا اگلا قدم اٹھاتا ہے۔ اس کے برعکس تجربہ کاری کی ساری کاری گری ذاتی نوعیت کی ہے۔ اس سے محض کوئی شخص، گروہ یا طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ فائدے کے حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز حربے کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اسی لئے تجربہ کاری انسانی معصومیت پر کاری ضرب ہے۔ یہ کسی معصوم بچے کا گرگِ باراں دیدہ بن جانے کا المیہ ہے۔

جمالیاتی حس رکھنے والے لوگ فطرت کے مناظر اور مظاہر کو دیکھ کر انوکھی سی روحانی آسودگی محسوس کرتے ہیں جبکہ تجربہ کاری کے ہنر سے آشنا لوگ ایسی روحانیت کو فضولیات میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ مسکراتے ہوئے گلاب دیکھ کر گلقند بنانے کا پلانٹ لگانے پر غور کرتے ہیں، پہاڑوں کو دیکھ کر بجری کے بزنس کا سوچتے ہیں، دریاؤں کو دیکھ کر کسی بھی ضروری یا غیر ضروری جگہ پر ایک اور پُل بنوانے کی اسکیم کی منظوری اور پھر اس کا ٹھیکہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں، جنگلات انہیں لکڑی چوری کرانے پر اکساتے ہیں۔ ہر چیز میں مادی افادیت کا پہلو انہیں اپنی طرف بلا لیتا ہے۔ ہمارے افادی ادب والے حضرات کا رویّہ بھی ادب کے ساتھ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ افادی ادب کی تجربہ کاری نے انہیں بڑی حد تک ادب سے ہی بے نیاز کر دیا ہے۔ تجربہ کار افادی ادب والے ادبا اچھا ادب بے شک تخلیق نہ کرسکیں افادی ادب اور اپنی تجربہ کاری کی برکت سے مادی فوائد ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ نجی افادیت کی اہمیت سے آشنا ہونے کے بعد بے شمار ذاتی فوائد کی خواہشات کے سامنے انہیں ادب بے حد حقیر لگتا ہے۔ محض ایک آلہ۔۔ چنانچہ ایسے لوگ ادب کو آلۂ کار بنا کر فائدے سمیٹتے رہتے ہیں۔

مجھے ایک شعلہ بیان مقرر کی چند تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے یہ بات شدّت سے نوٹ کی کہ کسی غم انگیز واقعہ کے بیان کے وقت شدّتِ غم سے ان کا گلا رندھ جاتا ہے آواز کی لرزش سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے آنسو بھی نکل آئے ہوں گے۔ لیکن گلا رندھنے کی کیفیت ختم ہونے سے پہلے ان کی شعلہ بیانی پھر اپنا جادو جگانے لگتی۔ میں نے اپنی ذات کے حوالے سے بہت غور کیا۔ اگر مجھ پر غم کی حالت طاری ہو اور گلا رندھ جائے تو بے شک آنسو نکلیں یا نہ نکلیں، دیر تک میری آواز نہیں نکل پاتی۔ میں کوشش کرنے کے باوجود بول نہیں پاتا چہ جائیکہ اسی لمحے شعلہ بیانی کرسکوں۔ چنانچہ میں نے مذکورہ شعلہ بیان مقرر کے ایک مرید سے ان کے مرشد کی کیفیت اور اپنی کیفیت کے فرق کا سبب پوچھا تو خوش عقیدہ مرید نے اسے مرشد کی کرامت قرار دیا لیکن اس کے ایک پیر بھائی جو کچھ کھلّے ڈلّے سے آدمی تھے کہنے لگے یہ ہمارے مرشد کے وسیع تجربے کا ثمر ہے۔ ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وسیع تجربے سے ان کی مراد یہی تجربہ کاری تھی۔ یہ وہی تجربہ کاری ہے جو اپنی عیاری کو حکمت اور دوسروں کی دفاعی حکمت کو بھی مکاری قرار دیتی ہے۔

تجربہ کاری۔۔۔ اخلاص، محبت، دیانتداری، ذاتی شرافت اور دیگر اعلیٰ انسانی اوصاف کو چنداں اہمیت نہیں دیتی۔ یہ تمام اوصاف رکھنے کے باوجود اگر کوئی تجربہ کار لوگوں کے فائدے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر حارج ہو رہا ہے تو اپنی تمام تر انسانی خوبیوں کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہے۔ اس کے برعکس اگر ٹھگ، لٹیرے، غنڈے اور قاتل قسم کے لوگوں سے مشن کو تقویت مل رہی ہے تو ان کے اخلاص، محبت، دیانت اور شرافت کے گن گائے جائیں گے۔ تجربہ کاری کا یہ اصول ہے کہ جو چیز اپنے مطلب اور فائدے کے مطابق ہے وہی سچائی ہے، باقی سب جھوٹ ہے۔ خدا کی سچی عبادت جو اپنا اجر آپ ہوتی ہے، تجربہ کار لوگوں نے اس کی لذّت بھی جنّت کی لالچ اور دوزخ کے خوف سے جوڑ دی ہے۔ شاید اسی لئے حضرت رابعہ بصری کو وہ دعا مانگنا پڑی جس میں خدا کی عبادت کسی بھی لالچ اور خوف سے پاک نظر آتی ہے اور جس کی لذّت ہی سب سے بڑی جنت ہے۔

یوں تو دنیا کے سارے ڈپلومیٹس تجربہ کاری کے زائیدہ ہیں لیکن دنیا کی واحد سپر پاور کے ڈپلومیٹس نے تجربہ کاری کی انتہاؤں کو چھو لیا ہے۔ جن مخصوص ممالک سے ان کے مفادات وابستہ ہیں وہاں کسی کو کانٹا بھی چبھ جائے تو واشنگٹن میں ان ڈپلومیٹس کا بچہ بچہ بے تاب ہو جاتا ہے لیکن جن خطّوں سے ان کے مفادات لگّا نہیں کھاتے، وہاں انسانی خون بیدردی کے ساتھ پانی کی طرح بھی بہایا جا رہا ہو تو ان کی بےفکری دیدنی ہوتی ہے۔ یہ ڈپلومیٹس

دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں لیکن اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے بعض ملکوں میں نہ صرف بادشاہتوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت بھی مسلّط کر دیتے ہیں۔ یہ کھیل تماشہ محض ڈپلومیسی یا سیاست نہیں بلکہ تجربہ کاری کا کمال ہے۔

علم ایک ایسا سمندر ہے جس میں انسان جتنا آگے بڑھتا ہے یہ اتنا ہی وسیع اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ علم کے حصول میں آگے بڑھنے والا جتنا آگے بڑھتا ہے اتنا ہی اس کی علمی بے مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے لیکن تجربہ کاری کا ہنر جاننے والوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے واجبی علم کی خامیوں کو چھپا کر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کریں گے۔ ایسے ہی ایک تجربہ کار صاحبِ علم کو جب میں نے بتایا کہ میں فارسی زبان نہیں جانتا تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا اظہار نہ کرنا ورنہ تمہاری سبکی ہوگی کہ اُردو کا ادیب ہے اور فارسی نہیں جانتا۔ میں نے مودبانہ گزارش کی کہ میں جتنا ہوں اتنا ہی دِکھنا چاہتا ہوں (جتنا دِکھتا ہوں یار لوگوں کو اتنا بھی دُکھتا ہوں) پھر اس میں سُبکی کہاں سے آ گئی؟ لیکن موصوف پھر بھی پورے خلوص سے مجھے اپنی نصیحت پر عمل کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ ان کی تجربہ کاری آج بھی ان کے کام آ رہی ہے۔ ان پر کیا موقوف۔ ہمارے ہاں مجلسی نوعیت کے ناقدین اور ''صاحبانِ علم'' اپنی تجربہ کاری کا آپ ثبوت ہیں۔

میں ابتدا میں کسی معصوم بچے کی طرح سادہ تھا۔ جس سے محبت اور خلوص کا اظہار کرتا اس سے سچ مچ محبت اور خلوص کا رشتہ محسوس ہوتا۔ رفتہ رفتہ دوسروں کے رویّوں سے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کسی پینڈو کی طرح کسی بہت بڑی آبادی والے شہر کی پُر ہجوم ٹریفک میں گھر گیا ہوں۔ رشتے، دوستیاں، محبت، ادب، ٹریڈ یونین، مذہب۔ زندگی کے ہر شعبے میں مجھے بے لوث اور محبت کرنے والے لوگ بھی نصیب ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر میں لوگوں کی تجربہ کاری کا نشانہ بنتا رہا ہوں۔ یار لوگ میری سادگی اور خلوص سے فائدہ بھی اٹھاتے اور بعد میں اس سادگی اور خلوص کو میری بے وقوفی قرار دے کر مجھ پر ہنستے۔ فائدے اٹھا کر آنکھیں بدل لینے والے دوستوں اور تضحیک کرنے والے کرم فرماؤں کے رویوں پر میں ایک عرصے تک حیران ہوتا رہا۔ لیکن اب میری حیرانی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یار لوگوں کی تجربہ کاری کا نشانہ بنتے بنتے شاید میں بھی اب تھوڑا بہت تجربہ کار ہو گیا ہوں۔

پتہ نہیں تجربہ کار ہو گیا ہوں یا اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں!

حیدر قریشی کے انشائیوں میں ذاتی مشاہدات اور تاثرات نمایاں ہیں اور ان کے اسلوب میں شعریت کا عنصر غالب ہے جس کی لطافت اور تہذیب الفاظ کا معیار فنی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

(**محمد وسیم انجم** بحوالہ ''حیدر قریشی فکر و فن'' صفحہ نمبر ۹۳)

کھٹی میٹھی یادیں

ددھیال کے رشتہ دار

میرے ددھیال میں ابا جی اور بابا جی صرف دو ہی بھائی تھے، بہن کوئی نہ تھی، سو ہماری کوئی پھوپھی نہ تھیں۔ تاہم ابا جی اور بابا جی کی دو کزنز تھیں۔ بُوا حیات خاتون اور بُوا لال خاتون۔ دونوں سے ہمیں پھوپھیوں کا اتنا پیار ملا کہ کسی حد تک پھوپھیوں کی عدم موجودگی کی تلافی ہو گئی۔ بُوا حیات خاتون چاچڑاں شریف میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ہمارے رحیم یار خاں میں قیام کے دوران، اور پھر خانپور میں قیام کے دوران بھی ان کا ہمارے ہاں مسلسل آنا جانا رہا۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ مجھے امی جی کے بعد بچپن میں سب سے زیادہ کہانیاں بُوا حیات خاتون نے سُنائیں۔ ان کی کہانیوں میں انسانوں، پرندوں اور جانوروں کے کردار مل جل کر رہتے تھے۔

بُوڑھی مائی نے کوّے سے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

چڑیا شہزادے سے کہنے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک کہانی جو مجھے آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے اس میں تو چوہا، بلّی، کتا، ڈانگ، آگ، چھوٹی نہر، بڑی نہر، درخت۔۔۔۔ یہ ساری چیزیں بھی باتیں کرتی تھیں۔ شاید ایسی کہانیاں انسان اور فطرت میں مغائرت سے پہلے کے، پرانے زمانے کی یادوں کی بازگشت ہوتی ہیں جو کچھ ہمارے شعور میں اور کچھ لاشعور میں ہمیں ورثہ در ورثہ ملتی رہتی ہیں۔

بوا حیات خاتون بڑھاپے میں بھی بے حد خوبصورت تھیں۔ ذہین لیکن دل کی سادہ۔۔۔ زمانے کی رفتار پر حیران لیکن اس کے حیرت انگیز ارتقا کو جانتی بھی تھیں اور مانتی بھی تھیں۔ ان کے برعکس بُوا لال خاتون بہت ہی بھولی بھالی تھیں۔ بُوا لال خاتون کوٹ شہباز میں بیاہی ہوئی تھیں۔ کوٹ شہباز قریشیوں کی اپنی بستی ہے۔ پہلے تو ایک ہی بڑی ساری حویلی تھی جس کے اندر سب کے اپنے اپنے گھر تھے۔ اب حویلی سے باہر بھی مکانات کی تعمیر ہو گئی ہے تاہم اصل حویلی ابھی بھی قائم ہے۔ اگر رحیم یار خاں سے ظاہر پیر کی طرف جائیں تو رستے میں ''شیخ واہن'' کا اسٹاپ آتا ہے۔ یہاں سے اندازاً دو میل کے فاصلے پر ''کوٹ شہباز'' ہے۔ بچپن میں ہم نے جب بھی کوٹ شہباز جانا ہوتا

تھا شیخ واہن کے بس اڈے پر ہمیشہ پہلے سے ایک تانگہ موجود ہوتا تھا جو ہمیں کوٹ شہباز لے جاتا تھا۔معروف سیاستدان مخدوم حمیدالدین ہاشمی اور مخدوم نور محمد ہاشمی صاحبان کا گاؤں ''میانوالی قریشیاں'' کوٹ شہباز سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔دونوں بستیوں میں قریشی برادری کا رشتہ تھا۔شادی اور مَرگ پر آنا جانا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔خیر بات ہو رہی تھی بُوا لال خاتوں کے بھولپن کی۔کسی عزیز کی بیماری کے باعث بُوا رحیم یار خاں آئیں۔ہسپتال میں عیادت کے لئے گئیں۔یہ ۶۰۔۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ہسپتال میں مریض کے قریب ایک پیڈسٹل فین رکھا ہوا تھا جو دائیں بائیں گھوم رہا تھا۔بُوا لال خاتوں نے ایک دو بار یہ منظر حیرت سے دیکھا پھر خوفزدہ ہو کر کہنے لگیں:

یہ کیا اَسرار ہے؟ یہ تو کوئی طلسماتی شے ہے۔خود بخود کبھی اِس طرف ہوا دینے لگتی ہے کبھی اُس طرف ہوا دینے لگتی ہے۔۔۔۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی رحیم یار خاں میں ہمارے گھر میں بھی بجلی نہیں آئی تھی۔لکڑی کے تختے سے بھاری بھرکم کپڑا لٹکا کر اسے چھت پر لٹکا دیا جاتا تھا۔تختے سے ایک مضبوط ڈوری باندھی جاتی پھر اسے ایک چرخی سے گزار کر کھینچا جاتا۔بجلی آنے سے پہلے ایسے پنکھے ہوا کرتے تھے۔کوٹ شہباز میں بھی ایسے ہی پنکھے تھے۔اب تو کوٹ شہباز بھی بجلی کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہا ہے۔

بُوا لال خاتوں پہلی بار لاہور گئیں۔ایک تو لاہور ریلوے اسٹیشن کی پُر شکوہ عمارت، پھر ہجومِ خلق۔اور اس ہجوم میں سُرخ وردی میں ملبوس قلیوں کی فوج ظفر موج۔۔۔۔اوپر سے قلیوں کا فرطِ ''محبت'' سے سامان اُٹھانے میں سبقت لے جانے کی کوشش، اور اس کوشش میں سامان کی کھینچا تانی۔۔۔۔بُوا لال خاتوں نے سمجھا ڈاکوؤں نے ہلّہ بول دیا ہے۔چنانچہ انہوں نے بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔۔۔کا شور مچا دیا۔

یہ بھولپن تو سن پچاس اور ساٹھ کے درمیانی عرصہ کا ہے۔اَسّی کی دہائی میں جبکہ گھر گھر ٹی وی پہنچ چکا تھا، اس زمانے میں بھی بھولے بھالے لوگ مل جاتے تھے۔خانپور میں مبارکہ کی ایک سہیلی تھی سعیدہ۔۔۔سعیدہ کی والدہ کنیز بی بی نے ساری زندگی فلم نہیں دیکھی تھی۔ان کے گھر ٹی وی آیا تو ماسی کنیز نے ٹی وی پر مَردوں کو دیکھ کر پردہ کر لیا تاکہ ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے مَرد انہیں بے پردہ نہ دیکھ لیں۔سعیدہ اور ماسی کنیز ابھی بھی خانپور میں مقیم ہیں۔اللہ انہیں خوش رکھے۔۔۔۔۔۔ہمارا معاشرہ جب تک ایسے معصوم لوگوں سے بسا ہوا تھا تب تک قناعت پسند اور آسودہ تھا۔علم کی برکات سے انکار نہیں لیکن جب سے ہمارے معاشرے میں معصومیت کی جگہ چالاکی آ گئی ہے، قناعت کی جگہ حرص نے لے لی ہے۔رزق کی فراوانی کے باوجود معاشرہ بے سکون اور بے چین ہے۔اس کے ذمہ دار بلا امتیاز ہم سب ہیں۔

کوٹ شہباز کے اہلِ قریش رحیم یار خاں جب بھی آتے، ہمارے ہاں قیام کرتے۔خانپور میں بھی ہمارا گھر ان کے قیام کا مرکز رہا۔رحیم یار خاں میں رہائش کے دنوں کی بات ہے میرا چھوٹا بھائی اکبر (جو اَب لندن میں مقیم ہے) گھر کے صحن میں بیٹھا مٹی سے کھیل رہا تھا۔تب اس کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی۔کھیلتے کھیلتے اچانک چونک کر بولا:''اوہ!'' امی جی اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو کہنے لگا: کوٹ شہباز والے آ رہے ہیں۔۔۔۔امی جی نے خیال کیا کہ بچے کو بعض عزیزوں کا خیال آ گیا ہوگا اس لئے ایسی بات کر دی ہے۔کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد اکبر نے پھر ویسی ہی ''اوہ!'' کی اور پھر بتانے لگا: ان کی جیپ خراب ہو گئی ہے۔امی جی تو ابا جی کی بزرگی اور روحانیت سے بھی الجھتی رہتی تھیں، کچھ کچھ معاملہ بھانپ گئیں اور کہنے لگیں: بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔۔۔۔ابھی ان کے باپ کی بزرگی مانی نہیں گئی اور یہ بیٹا بھی بزرگی جتانے لگا ہے۔تھوڑے وقفہ کے بعد اکبر نے پھر ''اوہ'' کی اور کہا: جیپ ٹھیک ہو گئی ہے۔اب وہ ہمارے گھر آ رہے ہیں۔۔۔۔اور پھر سچ مچ تھوڑی دیر کے بعد کوٹ شہباز والے آ گئے۔امی جی نے ان کے آتے ہی پوچھا: کیا آپ لوگوں کی جیپ رستے میں خراب ہو گئی تھی؟۔۔۔۔وہ سب کے سب ہکا بکا رہ گئے کہ یہ خبر ہمارے گھر کیسے پہنچ گئی۔اکبر جو اپنے آپ میں مگن بدستور مٹی سے کھیل رہا تھا، امی جی نے اس کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ہمیں تو ساری رپورٹ یہی دیتا رہا ہے۔

بوا لال خاتوں کے بعد بھی کوٹ شہباز کے عزیزوں سے پیار محبت کا تعلق قائم رہا۔یہ تعلق ختم تو نہیں ہوا لیکن اس میں تھوڑی سی دراڑ ضرور پیدا ہو گئی۔ہم لوگ قریشی ہونے کے باوجود ذات پات کو اہمیت نہیں دیتے۔میری والدہ باجوہ خاندان سے ہیں۔میری بیوی بھی باجوی ہے کہ میری ماموں زاد ہے۔رشتے ناطے میں ہم صرف ''موزوں رشتے'' کو اہمیت دیتے ہیں۔میری ایک بھابی جاٹ خاندان کی ہے، ایک ارائیں اور ایک اعوان۔ایک بہنوئی سید ہے، ایک راجپوت ہے اور دو جاٹ۔۔۔۔میری بڑی بہن کی شادی ہوئی۔کوٹ شہباز والے عزیز بڑے چاؤ سے شریک ہوئے۔شادی سے پہلے آ کر رونق لگائی۔رخصتی والے دن جب بارات آئی تو انہوں نے دیکھا کہ بارات میں اونچے اونچے طرّوں والے پنجابی جاٹ موجود ہیں۔اِدھر اُدھر سے سن گن لی۔جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ دولہا کا نام چوہدری عبدالرّحیم ہے اور قریشیوں کی بیٹی کا بیاہ ایک جاٹ سے ہو رہا ہے، اُن کی قریشی شان کو دھچکا سا لگا۔خاموشی سے ایک بس بُک کرا کے لائے اور تمام مرد، خواتین اور بچے بس میں بیٹھ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔شادی کے ہنگامے میں ہمیں پتہ بھی نہ چل سکا۔وہ تو جب رخصتی کا وقت آیا اور اُن میں سے بعض عزیزوں کو

آگے لانے کی ضرورت پڑی' تب پتہ چلا کہ وہ تو سب کے سب خاموش احتجاج کرتے ہوئے جا چکے ہیں۔تب ابا جی کو اپنے ان عزیزوں پر افسوس ہوا۔ان سے ملنا ملانا تو ترک نہیں کیا لیکن انہیں پھر کسی بچے کی شادی پر مدعو نہیں کیا۔

کوٹ شہباز کے عزیزوں کی بڑی بڑی زمینیں تھیں لیکن زیادہ تر غیر آباد۔۔۔۔۱۹۷۰ء کے لگ بھگ انہوں نے زمینوں کا صحیح استعمال کرنا شروع کیا۔ بھاولپور ڈویژن کے مختلف دیہاتوں میں ان کے مُرید موجود تھے۔ ہر چھ ماہ بعد پِیر صاحبان اپنا دورہ کرتے' سادہ لوح عقیدت مندوں سے ڈھیروں ڈھیر اناج' دوسری چیزیں اور نقدی سمیٹ لاتے۔ان سادہ لوح عقیدت مندوں کی دینی حالت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کر لیں:

ہم سارے گھر والے کوٹ شہباز گئے ہوئے تھے'وہاں بھائی شہان کے گھر (بوالال خاتوں اپنے اسی بیٹے کے ہاں رہتی تھیں) پنجاب کی سندھ سے ملحقہ سرحد کے کسی گاؤں سے چند مُرید خواتین آئیں (مُرید مَردوں کو باہر ڈیرے پر ٹھہرایا جاتا تھا)۔گھر کے دروازے سے باہر ہی وہ خواتین فرطِ عقیدت سے زمین پر بیٹھ گئیں۔وہاں سے کمرے تک کا فاصلہ جو لگ بھگ ۳۰ میٹر تھا' انہوں نے زمین پر گھسٹ گھسٹ کر طے کیا۔تمام بیبیوں کے پَیروں کو عقیدت سے چھُوا اور زمین پر ہی بیٹھی رہیں۔۔۔۔اسی دوران قریب کی مسجد سے ظہر کی اذان شروع ہوئی۔۔۔سب خاموش ہو گئے۔۔۔اذان ختم ہوئی تو سب نے کلمہ شریف پڑھا' مُریدنیاں حیرانی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔آخر ان میں سے ایک نے جو نسبتاً بڑی عمر کی تھی' بڑی ہی عاجزی سے بوالال خاتوں سے پوچھا:

''بی بی پہلے وہ جوان رُوڑ رہا تھا۔وہ چُپ ہوا تو آپ سب رُوڑنے لگ گئیں۔یہ کیا معاملہ تھا؟''

اگر یہ واقعہ ہمارا چشم دید نہ ہوتا تو میں کبھی بھی نہ مانتا کہ وطنِ عزیز کے کسی دیہات میں ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جن بے چاروں کو نہ کلمے کا پتہ ہے نہ اذان کا علم ہے۔کوٹ شہباز میں مُلیر درّن' مُلیر مِیم اور ادی بالن بفضلہٖ تعالیٰ زندہ ہیں' وہ یقیناً اپنی مخصوص مسکراہٹوں کے ساتھ اس واقعہ کی تصدیق کریں گی۔

ہم جب بھی کوٹ شہباز جاتے ہماری اس طرح آؤ بھگت کی جاتی جیسے ہم ان کے پِیر ہوں۔حویلی کا ہر گھر ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانے پر مُصر ہوتا تھا۔لیکن ہم نے ہمیشہ بوالال خاتوں کی بڑی بیٹی مُلیر دُرّن کے ہاں ہی قیام کیا۔میزبانی پر تُلے ہوئے اتنے گھر تھے کہ صبح' دوپہر' شام کے کھانے کے لئے ہمیں مشکل پڑ جاتی۔ پھر باقاعدہ ٹائم ٹیبل بناتے تاکہ ایک ہی وقت میں دو دو' تین تین گھروں میں کھانا تیار نہ ہو۔کوٹ شہباز کے قریشی اپنے مُریدوں سے مال سمیٹ لاتے تھے لیکن جب ہم واپس آنے لگتے' ساری حویلی کے گھروں سے اس طرح تحائف آنا شروع ہو جاتے جیسے مُریدانِ باصفا اپنے پِیروں کے سامنے نذرانے پیش کر رہے

ہوں۔گندم' چاول' پیاز' آلو' لہسن' چینی' گُڑ وغیرہا چیزوں کے ڈھیر لگ جاتے۔پھلوں سے لے کر کپڑوں تک اتنی چیزیں ہوتیں کہ ہمارے لئے انہیں گھر لے جانا مشکل ہو جاتا۔ یہ مشکل بھی پھر انہیں عزیزوں میں سے کوئی دور کرتا اور سارا سامان بحفاظت ہمارے گھر پہنچ جاتا۔وہ سارے تحائف اب بظاہر عجیب سے لگتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جو رشتوں کا تقدس' محبت اور خلوص کی دولت ہوتی تھی وہ اتنی قیمتی تھی کہ اس کے مقابلے میں آج کی زندگی کی ساری آسائشیں اور نعمتیں بے معنی لگنے لگتی ہیں۔

اوپر میں نے بعض ناموں کے ساتھ مُلیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ سرائیکی لفظ ہے۔ ماموں زاد رشتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔خالہ زاد کے لئے مُسات' پھوپھی زاد کے لئے پھوپھیر اور تایازاد' چچازاد کے لئے سوتر بولا جاتا ہے۔کوٹ شہباز کے عزیزوں کو یاد کرنے لگا ہوں تو کئی خوبصورت نام ستاروں کی طرح میری یادوں میں کہکشاں سی بنانے لگے ہیں۔ بوالال خاتوں کی اولاد میں میاں پِیرن دِتہ' میاں شہان' مُلیر درّن' مُلیر مِیم' ادی بالن'۔ پھر چاچا قادر بخش' چاچا گومے شاہ' میاں نواز شاہ'۔ان سب کی اولادوں میں میاں شہباز ن' میاں مجیدن' میاں رؤف' میاں کریم بخش' میاں سرفراز' میاں بھورل شاہ' میاں حبیبن' میاں فیضن' میاں ارشاد' میاں وڈا' میاں شیر' بی بی صغریٰ' بی بی رئیسہ' بی بی مکھنی' بی بی حرباب' بی بی اشفاق' بی بی پروین' بی بی مقصود' بی بی حاکم' بی بی ہوتن'۔۔۔۔۔۔۔۔ان کے علاوہ متعدد اور چہرے ہیں جو اس وقت پوری طرح میرے ذہن اور دل میں آئے ہوئے ہیں لیکن میری بدقسمتی ہے کہ مجھے ان کے نام یاد نہیں آ رہے۔ چاچا گومے شاہ اور چاچا قادر بخش ہم سے ہمیشہ اس بات پر شاکی رہے کہ ہم نے چچا کا رشتہ پسِ پشت ڈال دیا ہے اور بوا کے رشتے کو معتبر کر دیا ہے۔وہ ایک جملہ بھی بولا کرتے تھے: ''وو میاں! مُنڈھ کُوں چھوڑ تے پاندکوں پکڑی پے او۔مُنڈھ تاں اساں نال اے''ان کی اس شکایت میں بھی محبت ہی تھی۔

بی بی رئیسہ' مُلیر دُرّن کی بیٹی ہونے کی وجہ سے مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہے۔ پھر وہ میاں پِیرن دِتہ کے بیٹے وڈے میاں کی دلہن بن گئی تو مجھے اور عزیز ہو گئی۔ بی بی اشفاق بچپن میں بہت ہی پیاری بچی تھی۔ پتہ نہیں اسے کس کی نظر کھا گئی۔۱۹۹۱ء میں مبارکہ نے اور میں نے اب تک کا کوٹ شہباز کا آخری سفر کیا۔بی بی اشفاق کو دیکھا تو دل پر گھونسہ سا لگا۔بی بی رئیسہ اور بی بی حُرباب بھی اس کی حالت پر دُکھ کا اظہار کر رہی تھیں۔سارے کوٹ شہباز میں سب سے خوبصورت بچی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

کوٹ شہباز میں وٹہ سٹہ (بدلے کی شادی) کا رواج تھا' وہ بھی برابر کی قریشی برادری میں۔جس لڑکی کا وٹہ لینے کے لئے لڑکا نہیں ہوا' اُسے زندگی بھر شادی کے بغیر رہنا ہے۔میاں نواز شاہ کی بہن (نام یاد نہیں رہا) اور ادی بالن اسی

رسم کا شکار ہوئیں۔ان کے بجھے ہوئے چہرے یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ قریشِ مکّہ جو نام نہاد غیرت کے نام پر بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے،شاید اس لحاظ سے بہتر تھے کہ ایک ہی بار مار ڈالتے تھے جبکہ زندگی بھر کنواری بٹھا دی جانے والی بیٹیاں تو ہر پل میں ایک نئی موت کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔کوٹ شہباز میں تو صرف وٹے سٹے کا رواج تھا جبکہ باقی سرائیکی علاقے میں وٹے سٹے کا متبادل ٹکا کہلاتا ہے۔یعنی اگر رشتہ کے بدلے میں رشتہ نہیں ہے تو ایک معقول رقم ادا کر کے لڑکی کا رشتہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وٹہ سٹہ میں ایسے بھی ہوا کہ باپ نے اپنی بیٹی بیاہی اور اس کے بدلہ میں دولہا والوں کی بہن سے اپنی دوسری شادی رچالی۔ایسا مفاہمانہ رویّہ بھی دیکھنے میں آیا کہ لڑکی بیاہتے وقت فریق ثانی کے پاس وٹہ نہیں تھا تو اس نے اپنے ہاں ہونے والی پہلی بیٹی وٹہ میں لکھ دی۔اسے ’’پیٹ لکھوالینا‘‘ کہا جاتا ہے۔ٹکے والی شادی میں صرف رقم بھی چلتی ہے اور رقم کے ساتھ دوسری چیزیں بھی۔۔۔۔۔۔۔۔مثلاً ایک بکری،دو مُرغیاں،ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل اور ۵۰۰ روپے دے کر لڑکی کا رشتہ حاصل کیا گیا۔تاہم قریشیوں میں صرف وٹہ سٹہ ہی کا رواج تھا،وہ بھی صرف قریشیوں کے ساتھ۔امی جی پنجابی تھیں۔ان کے خاندان میں وٹہ سٹہ جیسی کوئی قبیح رسم رائج نہیں تھی۔ابا جی سے ان کی شادی ہوئی۔پہلی دفعہ سرائیکی ماحول میں آئیں۔پندرہ برس کی عمر۔۔۔اتنی خوبصورت لڑکی۔۔۔۔دلہن کو دیکھنے کے لئے آنے والیاں پوچھتیں:بہن!وٹہ تو قریشیوں کا تھا نہیں۔۔۔پھر ٹکا دیا ہوگا؟

کوئی رشتہ دار خاتون جو امی جی کا خیال رکھنے کے لئے موجود ہوتیں،جواب دیتیں:

نہیں بہن ٹکا نہیں لیا،اللہ واسطے دی ہے۔

جب دس بارہ خواتین نے یہی بات کی اور ہر بار یہی وضاحت کی گئی تو امی جی نے رونا شروع کر دیا۔تب ابا جی نے انہیں سمجھایا کہ علم کی کمی کے باعث ہمارے علاقے میں بہت ساری غیر اخلاقی اور غیر اسلامی رسمیں رائج ہیں۔آپ ایسی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں کہ ہماری شادی تو درست اسلامی طریق سے ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ویسے کوٹ شہباز کے قریشیوں میں بھی اب بیٹیوں کے رشتے کی اہمیت واضح ہونے لگی ہے۔رشتے تو بے شک قریبی رشتہ داروں میں کئے ہیں لیکن اب وٹے سٹے کے بغیر بھی رشتے کرنے لگے ہیں۔اس معاملے میں میاں نواز شاہ،میاں کریم بخش،میاں ارشاد،میاں فیضن اور مُلیر دُرّن کو وہاں کے ابتدائی انقلابی قرار دیا جا سکتا ہے۔مجھے امید ہے کہ ان چراغوں سے مزید چراغ جلے ہوں گے اور قبیح رسموں کا اندھیرا مسلسل کم ہوتا جا رہا ہوگا۔

ایک زمانہ تھا جب کوٹ شہباز میں اسکول نہیں کھلنے دیا جاتا تھا۔نوکری کرنے کو اپنی توہین سمجھا جاتا تھا۔خدا خدا کر کے ایک اسکول کھولا گیا تو صرف لڑکوں کے لئے۔۔۔لڑکیوں کو پڑھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔وہی زمانۂ جاہلیت کے قریشِ مکّہ والی باتیں۔۔۔لیکن آس پاس کے علاقوں میں تو علم کی روشنی پھیل رہی تھی۔سو پیروں کے مُرید باغی ہونے لگے۔ان کی تعداد کم ہونے لگی۔فارغ بیٹھ کر روٹی کھانے کا امکان ختم ہونے لگا تو علم کے حصول کا احساس بھی ہونے لگا۔چنانچہ اب بعض لڑکے پڑھ لکھ کر نوکریاں کرنے لگے ہیں۔بالآخر لڑکیوں کا اسکول بھی کھول دیا گیا ہے۔بعض قریشیوں نے خود کاشتکاری کی طرف توجہ کی ہے۔باغات لگائے ہیں۔بعض نے تجارت کا پیشہ اپنا لیا ہے۔خدا ان سب کے کاروبار کو ترقی عطا کرے،ان کے اموال میں برکت بھر دے اور انہیں خوش رکھے۔ہمارے ددھیال کے ان دور کے رشتہ داروں نے ہمیں کبھی دل سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ہمیشہ اتنی محبت دی کہ ہماری جھولیاں چھوٹی پڑ گئیں۔

آپی کی رُخصتی سے پہلے ان لوگوں کا خاموشی سے رُوٹھ کر چلے جانا بھی ان کی محبت ہی کا ایک انداز تھا۔

قبیلہ ءِ قریش والی محبت کا انداز!

کزنز

میرے چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی بہن نہیں ہیں۔خالہ زاد بھائی بہنوں میں صرف خالہ سعیدہ کی دو بیٹیاں صالحہ اور نعیمہ میرے ایج گروپ میں آتی ہیں۔خالہ حبیبہ کے بیٹے،بیٹی عمر کے لحاظ سے مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔سو اُن سے محبت کا تعلق تو ہے لیکن دوستانہ بے تکلفی والی بات نہیں ہے۔میرے تین ماموں زاد صحیح معنوں میں میرے ایج گروپ کے ہیں۔کریم اللہ،مجید اللہ اور مبشّر۔۔۔۔کریم اللہ،مجید اللہ جڑواں بھائی ہیں اور بڑے ماموں کے بیٹے ہیں۔مبشّر میری بیوی کا بھائی اور ماموں ناصر کا اکلوتا بیٹا ہے۔ماموں کوثر کا بیٹا شکور اگرچہ عمر میں مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا لیکن بے تکلفی میں سب سے آگے تھا۔باقی ماموں زاد اور خالہ زاد یا تو عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں یا بہت چھوٹے۔اسی لئے ان کے معاملے میں احترام یا شفقت کا ایک پردہ حائل ہے۔اپنی ماموں زاد آپی نعیمہ سے بچپن میں میری گہری دوستی تھی۔صالحہ اور نعیمہ دونوں میری کھوئی ہوئی کزنز ہیں۔خالہ سعیدہ ہالینڈ میں مقیم تھیں۔وہاں ان کی اپنے شوہر سے ناچاقی ہوگئی۔معاملہ بڑھا تو دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔خالہ سعیدہ غم وغصہ کی حالت میں دونوں بیٹیوں صالحہ اور نعیمہ کو بھی ان کے والد ڈاکٹر غلام احمد بشیر صاحب کے پاس چھوڑ آئیں۔صالحہ

اور نعیمہ کو ان کے والد ڈاکٹر غلام احمد بشیر اور ان کی دوسری (ڈچ) بیوی نے پالا پوسا۔ وہ دونوں فوت ہو گئے۔ صالحہ اور نعیمہ کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ جرمنی آنے کے معاً بعد سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تک کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم بچپن کے بچھڑے ہوئے کزنز ایک بار ضرور آمنے سامنے ہوں گے۔ چاہے یہ آمنا سامنا بڑھاپے کی سرحد پر ہی کیوں نہ ہو۔☆ا

مجھے یقین ہے کہ جب بھی ہماری ملاقات ہوئی صالحہ کو یاد آ جائے گا کہ مکئی کے کھائے ہوئے سِٹّے کو توڑ کر اور اس میں چڑیوں اور کبوتروں کے پروں کو ٹھونس کر وہ کیسی عمدہ شٹل بنایا کرتی اور ہم دونوں ریکٹ کے طور پر اسکول کی تختیوں کو استعمال کرتے ہوئے اس شٹل سے اپنی دیسی بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ نعیمہ کو اور کچھ یاد آئے نہ آئے لیکن یہ تو ضرور یاد آئے گا کہ اسے بچپن میں مٹی کھانے کا شوق تھا جبکہ آپی میں اور صالحہ خدائی فوجدار کی طرح اس کی تاک میں رہتے تھے۔ ایک بار اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا تھا۔ ہمسایوں کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھتی پھر بڑی مہارت کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے کچی مٹی کی دیوار کو چاٹ لیتی۔ اس کی تمام تر مہارت کے باوجود میں نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ اور پھر حسبِ معمول صالحہ، آپی اور میں۔۔۔۔۔۔ ہم تینوں نعیمہ کو ٹانگوں اور بازوؤں سے اٹھائے ہوئے گھر لئے جا رہے تھے جہاں لازماً اسے خالہ سعیدہ سے ڈانٹ پڑنی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد رشید احمد صدیقی کا پُر لطف مضمون ''میرا بچپن'' پڑھا تو شگفتگی کے تمام تر احساس کے باوجود میں اداس ہو گیا۔ مجھے صالحہ اور نعیمہ دونوں خالہ زاد بہنیں بہت یاد آئیں۔

کریم اللہ، مجید اللہ مجھ سے سوا سال بڑے ہیں جبکہ مبشّر مجھ سے ایک سال چھوٹا ہے۔ بچپن میں ہی مبشّر کی دوستیاں بڑی عمر کے لوگوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔ لڑائی بھڑائی میں بھی وہ تیز تھا۔ میں جسمانی لڑائی میں ہمیشہ سے پھسڈی ہوں۔ کریم اللہ، مجید اللہ تو اس معاملے میں میرے بھی بڑے بھائی ہیں۔ جڑواں بھائی ہونے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ وابستہ تھے۔ اب تو خیر ان کی شکلیں صاف پہچانی جاتی ہیں لیکن بچپن میں تو انہیں پہچاننے میں اچھے اچھوں کو مغالطہ ہو جاتا تھا۔ اباجی نے کئی بار دونوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ کافی غور سے دونوں کے چہرے دیکھنے کے بعد جب اباجی ایک کو کریم اللہ کہتے تو وہ مجید اللہ نکلتا اور جسے مجید اللہ کہتے وہ کریم اللہ نکلتا۔ دونوں کو پہچان نہ پانے پر اباجی پھر خود ہی ہنسنے لگ جاتے۔ ایک بار اباجی نے کسی شناخت کی بنیاد پر نہیں بلکہ تکے سے ٹھیک نام بتا دیا کہ تم کریم اللہ ہو تب کریم اللہ نے بڑی مہارت سے کہہ دیا: نہیں پھوپھا جان میں تو مجید اللہ ہوں۔ اور اباجی انہیں پہچان نہ پانے پر ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگے۔

بچپن میں میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تو میں عام طور پر مبشّر کو مدد کے لئے بُلا لاتا تھا۔ ایک بار پتہ نہیں کس بات پر میرا کریم اللہ اور مجید اللہ سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ دو بھائی، میں اکیلا۔۔۔ اتفاق سے مبشّر نے دور سے ہی یہ منظر دیکھا اور از خود لپکا چلا آیا۔ آتے ہی اس نے دخل در معقولات کرتے ہوئے مجید اللہ کو پکڑا اور اس کا سر ریت میں گھسانے لگا، اور مجھے بھی ہدایت کی کہ صرف مجید اللہ پر ہی سارا زور لگاؤں۔ اوپر سے کریم اللہ ہم دونوں کو مار رہا تھا لیکن مبشّر یہی کہے جا رہا تھا کہ مجید اللہ پر ہی سارا زور لگاؤں۔۔۔۔۔ ہم دونوں کے زور کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجید اللہ نے رونا شروع کر دیا۔ مجید اللہ کے روتے ہی کریم اللہ نے نہ صرف ہمیں مارنا چھوڑ دیا بلکہ خود بھی رونے لگ گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ مبشّر صرف ایک ہی بھائی پر سارا دباؤ کیوں ڈال رہا تھا۔ جڑواں بچوں کی محبت کا یہ بھی انوکھا رنگ تھا۔ مبشّر کی ''پھوں پھاں'' اور ''ٹے کا'' بہت تھا اسی لئے اس کی دوستی سے مجھے فائدہ ہو جاتا تھا۔ ایک بار پتہ نہیں کس بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ مبشّر نے پتری کا ایک ننھا منا سا چاقو مجھ پر تان لیا۔ میں نے وہیں سے دوڑ لگائی اور نانا جی کو جا کر بتایا کہ مبشّر مجھے چاقو مارنے لگا تھا۔ نانا جی نے فوری کارروائی کے لئے ماموں سمیع اللہ کو بھیجا۔ ماموں سمیع نے آ کر مبشّر کو ایک چپت رسید کی تو وہ کہنے لگا کہ میں تو صرف ڈرا رہا تھا۔ اس چاقو کی ''خوفناکی'' کا اندازہ اس سے لگالیں کہ ماموں سمیع نے اسی وقت مبشّر سے لے کر انگلیوں سے مروڑ تروڑ کر اسے دور پھینک دیا تھا۔

چھوٹے کزنز میں سے خالہ سعیدہ کی دوسری شادی سے ہونے والی پہلی بیٹی زاہدہ، ماموں ناصر کی غزالہ، ماموں سمیع کی نوشی، ماموں صادق کی سمیرہ اور خالہ حبیبہ کا آصف مجھے زیادہ عزیز رہے ہیں۔ زاہدہ میرے چھوٹے بھائی اکبر سے بیاہی گئی اور میری چھوٹی بہن زبیدہ کی شادی کریم اللہ سے ہوئی۔ سمیرہ اور آصف مجھے اس لئے بھی عزیز رہے کہ دونوں نے کبھی شاعری شروع کی تھی۔ ماموں صادق خود ایک عرصہ تک شاعری کرتے رہے تھے۔ اس لئے مجھے لگتا تھا کہ سمیرا ماموں صادق کا شاعری کا ورثہ ضرور سنبھالے گی۔ لیکن وہ تو کمپیوٹر ایکسپرٹ بن گئی۔ شاعری کہیں بیچ میں ہی رہ گئی۔ آصف کی شاعری سے عطاء اللہ خاں نیازی عیسیٰ خیلوی کی گلوکاری کی طرف دھیان جاتا تھا۔ لیکن ابتدا میں ایسا ہونا بھی غنیمت تھا۔ کچھ عرصہ تک آصف کو شاعری کا شوق رہا پھر اس کا بھی پتہ نہیں چلا۔

ماموں ناصر کی سب سے چھوٹی بیٹی بشریٰ ہما کو بیک وقت شاعری اور گلوکاری کا شوق ہے۔ ایک دفعہ اس نے مجھے اور مبارکہ کو لتا جی کے چند گانے سنائے۔ گانے سُن کر میں حیران رہ گیا۔ بشریٰ نے بڑے اچھے انداز میں لتا جی کے گانے سنائے تھے لیکن میری حیرت کا پس منظر کچھ اور تھا۔ دراصل ممانی آصفہ نے گھر کا ماحول بے حد مذہبی بنایا ہوا تھا۔ ٹیلی ویژن صرف ان اوقات میں آن کیا جاتا تھا جب اس پر تلاوت، اذان، کوئی دینی پروگرام یا پھر خبرنامہ آ رہا ہو۔ ایسے ماحول میں بشریٰ نے اتنے گانے کیسے یاد کر لئے اور اپنی آواز میں اتنی پختگی کیسے پیدا کر لی؟ میں نے اپنی حیرت کو چھپائے بغیر سیدھا سوال کر دیا تو بشریٰ نے شرماتے ہوئے بتایا۔۔۔ بھائی جان! وہ اصل میں

ناں ۔۔۔۔۔۔وہ جب ٹی وی پر اذان لگتی تھی تو میں اذان کے ساتھ اپنی آواز اٹھاتی تھی اس طرح آواز پر گرفت ہوتی گئی۔ پھر جب باجی غزالہ جرمنی چلی گئیں تو وہ اپنا چھوٹا ٹیپ ریکارڈر مجھے دے گئیں۔اس میں مہندر کپور کے گانوں کی ایک کیسٹ تھی۔اس کیسٹ میں وہ گانا بھی تھا ''نہ منہ چھُپا کے جیئو اور نہ سر جھُکا کے جیئو''۔جب امی گھر پر نہیں ہوتی تھیں تو میں اسی گانے پر آواز اُٹھانے کی پریکٹس کرتی تھی۔یوں اب گانے کا شوق پورا کر لیتی ہوں لیکن امی سے چوری چھپے۔آپ بھی امی کو نہیں بتائیے گا۔ان کے سامنے تو میں صرف دینی نظمیں سُر کے ساتھ پڑھتی ہوں۔

ماموں صادق کا بیٹا اویس میرے بڑے بچوں کے ایج گروپ کا ہے۔گزشتہ تین برس سے امریکی آرمی کی طرف سے اس کی جرمنی میں تعیناتی ہوئی تو اس سے بھی تھوڑی سی دوستی ہوگئی۔اس کے بچپن اور اپنے ''عالمِ شباب'' کا ایک لطیفہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔میں خانپور سے کراچی گیا۔قیام ماموں صادق کے ہاں تھا۔اویس پانچ، چھ سال کا تھا۔مجھے کافی دیر تک دیکھتا رہا۔پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا: بھائی! آپ ہیں تو آدمی، پر لگتے نہیں ہیں۔میں اس کے جملے کی سادگی کا مزہ لے رہا تھا کہ ماموں صادق کہنے لگے: یار! تم شادی شدہ ہونے کے باوجود لڑکے ہی لگتے ہو۔اویس کی دانشمندی دیکھو کہ اس نے لڑکے میں چھپے ہوئے مرد کو کیسے پہچان لیا ہے۔ماموں صادق کی وضاحت کے باوجود مجھے اویس کے جملے کی سادگی مزہ دیتی رہی۔اب جرمنی میں اویس آیا تو میں نے اسے اس کی بات یاد دلائی۔

غالبؔ کو یہ گِلہ رہا کہ ''آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا''۔لیکن اب تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ آدمی کو آدمی ہونا بھی میسّر نہیں ہے، آدمی یا تو روبوٹ بن گیا ہے یا جانور۔۔۔۔اویس کے آنے کے بعد ایک بار میں شیو کر کے فارغ ہوا اور آئینے میں خود کو دیکھنے لگا تو مجھے اپنے ہی اندر سے آواز آئی: لگتے تم آدمی ہو، پر ہو نہیں۔

پتہ نہیں یہ میری اپنی آواز تھی

آدم کی روح کی آواز تھی

یا پھر روحِ کائنات کی!

حیدر قریشی صاحب کی یادیں دلچسپی سے پڑھیں۔کچھ اس بنا پر بھی کہ اس میں رحیم یار خاں کا ذکر ہے، جس سے میری یادیں بھی وابستہ ہیں۔ش۔۔**صغیر ادیب** (انگلینڈ)

(خط مطبوعہ دوماہی ''گلبن'' احمد آباد شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

حیدر قریشی کے سفر نامہ ''سُوئے حجاز'' کا ایک باب

مکّہ کے تاریخی اور مقدس مقامات

۶ رد سمبر کو ہمیں مکہ شریف پہنچے چوتھا دن ہو رہا تھا سو گردونواح کے تاریخی اور مقدس مقامات دیکھنے کا پروگرام بنا۔صبح ۶ بج کر ۲۵ منٹ پر ہم روانہ ہوئے اور سوا نو بجے تک لوٹ آئے۔ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور نے یہ سارے مقامات دکھائے اور بہترین گائیڈ ثابت ہوا۔ ہمارے ہوٹل سے قریب ترین مقام ''شبیقہ'' تھا۔ یہ وہ خوفناک قبرستان ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں کفّار مکہ اپنے گھر میں بیٹی پیدا ہونے پر ''غیرت'' کا مظاہرہ کرتے تھے۔بیٹی کو یہیں لا کر زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔انسان اپنی جہالت کے باعث ''غیرت'' کے نام پر کیسے کیسے ظلم ڈھاتا رہا ہے اور آج بھی دوسرے حوالوں سے یہی جہالت ''غیرتوں'' کے کیسے کیسے غیر انسانی مظالم کو فخریہ طور پر روا رکھ رہی ہے۔ویسے اُس زمانے میں سارے قبیلے ایسا نہیں کرتے تھے۔بعض قبیلے ہی جھوٹی غیرت کے نام پر اس انسانیت سوز ظلم کے مرتکب ہوتے تھے۔اس وقت اچانک مجھے ایسے لگا ہے جیسے اُن سفاک لوگوں سے میری بھی کوئی دور کی، پرانی رشتہ داری ہے۔شاید اسی لئے مجھ سے ایسا شعر ہوا ہے:

اس کی چیخوں کی صدا آج بھی آتی ہے مجھے

میں نے زندہ ہی تری یاد کو دفنایا تھا

شبیقہ سے تھوڑا آگے گئے تو ''جنت المعلیٰ'' آ گئی۔ یہ جگہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی مفلوک الحال جنت بی بی بیوہ بھی ہوگئی ہو۔قبر پرستی سے خوف بھی کیا کیا گل کھلا دیتا ہے۔سعودی خاندان نے امّت مسلمہ کو ''مشرکانہ'' رسومات سے بچانے کے لئے پورے قبرستان پر بلڈوزر چلوا دیا ہے۔ یہاں اب قبرستان نہیں بلکہ ''رڑا میدان'' ہے۔حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت عبدالمطلبؓ، حضرت ابوطالبؓ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین صاحبزادگان حضرت قاسمؓ، حضرت طاہرؓ اور حضرت طیبؓ (چوتھے فرزند حضرت ابراہیمؓ مدینہ میں جنت البقیع میں دفن ہیں) اور متعدد صحابۂ کرامؓ اس قبرستان میں مدفون ہیں۔ جنت البقیع کے بعد یہ قبرستان دنیا بھر کے قبرستانوں سے افضل سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں آپ کسی مزار کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔کوئی پتہ نہیں کہ کون کہاں مدفون ہے۔اگر قبر کا کچی مٹی کا تعویذ بھی نہیں رہنے دینا تو پھر قبر پرستی سے اتنے ڈرنے والے ''موحدین'' کو تدفین کی ضرورت ہی کیا ہے۔

سیدھا سیدھا رام نام ست ہے۔ بولو....اور شمشان گھاٹ لے چلو۔ نہ رہے کوئی قبر اور نہ رہے قبر پرستی کا خوف۔ پکے موحد بن جائیے۔(استغفر اللہ)

جنت المعلّٰی کے کھلے میدان میں (اسے قبرستان کی جگہ اب میدان ہی کہنا چاہیے) میں نے کھڑے ہو کر سارے بزرگوں کے لئے دعا کی اور باہر نکل آیا۔ یہاں خواتین کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف طوافِ کعبہ اور سعی کے دوران عورتیں اور مرد یک جا ہوتے ہیں۔ تب روحانیت کے ساتھ انسانیت بھی معراج پر ہوتی ہے۔ کوئی فرقِ من و تو نہیں ہوتا۔ لیکن جیسے ہی نماز کی اذان ہوتی ہے پُلسیئے خواتین کو الگ سائڈ پر ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں قبرستان سے باہر آیا تو مبارکہ مغموم سی کھڑی تھی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور بتایا کہ میں اندر کا حال دیکھ کر زیادہ مغموم ہوا ہوں... جنت المعلّٰی کے بعد ہم مسجد جن کے سامنے گئے۔ روایت ہے کہ جن صاحبان حضورؐ سے اس مقام پر ملے تھے اور ایمان لائے تھے۔ یہ مسجد صرف نماز کے معین اوقات میں کھلتی ہے پھر بند کر دی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے بعض زائرین یہاں آ کر بھی ''مشرکانہ'' حرکات کرتے ہوں جو جِنّوں کو اچھی نہ لگتی ہوں۔ مسجد جن سے تھوڑا آگے مسجد شجر ہے۔ یہاں ایک درخت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غارِ حرا تشریف لے جایا کرتے تھے تو آتے اور جاتے ہوئے اس درخت کے نیچے آرام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مشرکانہ رسومات کے ڈر سے وہ درخت کٹوا کر وہاں مسجد بنوا دی۔ اب اس مسجد کو مسجد عمر فاروقؓ کہتے ہیں۔ مسجد عمر کے نزدیک ہی مسجد الرایۃ ہے۔ اسے مسجد الفتح بھی کہتے ہیں۔ فتح مکہ کے موقعہ پر حضورؐ نے یہاں اسلام کی فتح کا پرچم لہرایا تھا۔ اسی جگہ کعبہ کا متولی رہتا تھا۔ کعبہ کی چابی اس کے پاس ہوتی تھی۔ اس سے چابی لے کر حضورؐ نے خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے ۳۶۰ بت توڑے تھے اور کعبہ کی دیواروں سے لگی ہوئی تصویریں بھی پھاڑ دی تھیں۔ بت توڑنے اور تصویریں پھاڑنے کے بعد حضورؐ نے خانہ کعبہ کی چابی پھر اسی متولی خاندان کے سپرد کر دی تھی۔ سعودی خاندان کے آنے کے بعد کیا صورتحال ہے؟ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ تاہم خانہ کعبہ کی چابی آج بھی مسجد الفتح ہی میں محفوظ ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ میں موجود ۳۶۰ بتوں کو توڑنے کے تاریخی واقعہ کے ساتھ ہی مجھے ہندوستان کے بی جے پی کے ایک لیڈر کا بیان یاد آ گیا۔ بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ ہی جامع مسجد دہلی اور بعض دیگر مساجد کے بارے میں بھی اشتعال انگیز بیان داغے گئے تھے۔ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جب مسلم لیڈروں نے دکھ اور غصے کی حالت میں شدید ردعمل ظاہر کیا تب طاقت کے نشے میں بی جے پی کے ایک لیڈر نے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ ہندوستان کی مسجدوں کے معاملے پر شور کر رہے ہیں، ہمیں تو مکہ میں اپنا بڑا مندر بھی لینا ہے جہاں آپ نے ہمارے سارے بُت توڑ کر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس بیان کے ساتھ ہی ایسا طوفانی ردِّعمل سامنے آیا تھا کہ بی جے پی کے لیڈر گھبرا گئے۔ ان کی ہائی کمان نے فوراً اس بیان سے لاتعلقی کر کے اور معذرت خواہانہ وضاحت کر کے اپنی جان چھڑائی۔

اسلام جہاں بت پرستی کے خلاف ہے وہیں تصویر کی بھی ممانعت کرتا ہے۔ شروع شروع میں فوٹو گرافی کے لئے مذہبی رہنماؤں نے مجبوری کے تحت جائز کا فتویٰ دیا اور پھر شخصیت پرستی کے رویّے کو پوری طرح فروغ دیا۔ بعض ''موحد'' فرقوں کے گھروں میں جا کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کے گھروں میں کرشن جی اور رام جی کی مورتیاں اتنے اہتمام سے نہیں سجی ہوں گی جتنے اہتمام سے ان ''موحد'' فرقوں کے رہنماؤں کی تصویریں سجی ہوئی ہیں۔ پھر بعض ''موحد'' قسم کی حکومتوں نے سرکاری کرنسی نوٹوں پر اپنی شاہانہ تصویریں طمطراق سے چھپوا رکھی ہیں۔ بس جہاں جی چاہے بت پرستی اور تصویر پرستی کی مذمّت کر دیجئے اور جہاں جی چاہے اپنی نمائش پسند نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے جواز پیدا کر لیجئے۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

مسجد الفتح کے بعد ہم نے مسجد علیؓ دیکھی۔ حضرت علیؓ اکثر عشاء کی نماز یہاں پڑھایا کرتے تھے اسی مناسبت سے اس کا نام مسجد علیؓ ہے۔ کافی خوبصورت مسجد ہے۔ یہاں سے ہم حرم شریف کی دوسری سمت میں آ نکلے۔ جبل الابوقبیس کے ایریا میں بہت سارے اسلامی تاریخی مقامات تھے مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام پیدائش، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکان، حضرت حسّان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور متعدد دیگر صحابہ کرام کے مکانات.... شعبِ ابی طالب جہاں مسلمانوں کو تین سال کے لگ بھگ کفارِ مکّہ کی ''نفرت انگیز دینی غیرت'' کا نشانہ بن کر محصور ہونا پڑا تھا۔ کفار مکہ نے مسلمانوں کا انتہائی سخت سوشل بائیکاٹ کیا تھا... یہ سارے مقامات ضائع کر دیئے گئے ہیں۔ ایک طرف ''مکتبہ مکۃ المکرّمہ'' کے نام سے کتب خانہ بنا دیا گیا ہے۔ دوسری طرف شاہی خاندان کے محلّات میں بعض مقام غائب ہو گئے ہیں۔ شاہی خاندان کے محلّات کے سلسلے میں تو کوہ صفا کا بہت سارا حصہ بھی لے لیا گیا ہے۔ سعی کرنے والوں کے لئے تھوڑی سی کوہ صفا کی نشانی چھوڑ دی گئی ہے جو ظاہر ہے خاندان کی خاص مہربانی ہے۔ جبل الابوقبیس کے بارے میں دو روایتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ حضورؐ نے یہیں سے چاند کو دو ٹکڑے کرنے کا معجزہ دکھایا تھا۔ دوسری یہ کہ زمین کو متوازن رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلا پہاڑ یہی بنایا تھا، نیز حجر اسود اسی پہاڑ سے لیا گیا تھا۔ شق القمر والے مقام پر اب ایک مسجد ہے اسے مسجد بلال کہا جاتا ہے۔

جبل ابوقبیس کے بعد ہم مکہ مکرمہ سے تھوڑا باہر جبل ثور کی طرف گئے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر غارِ ثور ہے۔ یہ وہی غار

ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرتِ مدینہ کے دوران تین راتیں قیام فرمایا تھا۔کفارِ مکہ آپؐ کی تلاش میں تھے۔اس سفرِ ہجرت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی حضورؐ کے ہمراہ تھے یوں ''یارِ غار'' کا اعزاز ان کا نصیب ہو گیا...غارِ ثور خاصی دور تھا۔میں پہاڑ کی چڑھائی چڑھ کر چوٹی تک جانا چاہتا تھا مگر مبارکہ کی حالت کا خیال کر کے اپنی یہ خواہش چھوڑ دی۔یوں بھی غارِ ثور تک پہنچنے کے لئے اور پھر واپس آنے کے لئے پورے ایک دن کا پروگرام بنانا ضروری ہے۔یا پھر دشمنوں کا کوئی گروہ پیچھے لگا ہو تو چڑھائی آسان ہو سکتی تھی...لیکن میرے اندر کے صحرا میں کہیں، کسی طرف میرے اپنے ہی اندر کے کافروں اور دشمنوں کا ایک گروہ بھی تو میرے پیچھے لگا ہوا ہے اور مجھے ابھی تک اپنی ذات کے غارِ ثور تک پہنچنا نصیب نہیں ہو سکا۔شاید میں ابھی تک اپنی ذات میں شعبِ ابی طالب کے مرحلے سے گذر رہا ہوں....آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس غار میں قیام فرما تھے تب غار کے دہانے تک پہنچ کر رک جانے والے کھوجیوں نے دعوے سے کہہ دیا تھا کہ یا تو آپؐ اسی غار کے اندر ہیں یا آسمان پر چلے گئے ہیں۔غار کے اندر موجودگی اس لیے ماننے میں نہیں آتی تھی کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا بُن دیا تھا۔چنانچہ پھر بعض لوگوں نے رائے ظاہر کی کہ چونکہ حضورؐ ایک بار پہلے بھی طائف جا چکے ہیں اس لئے ممکن ہے اب پھر طائف چلے گئے ہوں کیونکہ جبل ثور کے دوسری طرف اتر جائیں تو وہاں سے لگ بھگ ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر طائف شہر ہے۔

جبل ثور کو دور سے دیکھنے کے بعد ہم میدان عرفات کی طرف نکل گئے۔۹رذی الحج کو حاجی صاحبان یہاں پہنچتے ہیں۔وقوفِ عرفات حج کا رکن اعظم ہے۔یہاں قیام کر کے دن بھر دعائیں کی جاتی ہیں۔ہمارا ٹیکسی ڈرائیور بتا رہا تھا کہ روزِ حشر کو ساری دنیا یہیں جمع ہوگی۔مجھے پہلے تو اس کی بات پر ہنسی آئی کہ صرف اسی زمانے کے پانچ ارب انسان بھی اس میدان میں سما نہیں سکتے تو سارے گذرے اور آنے والے زمانوں کے کھربوں انسان کہاں سمائیں گے۔لیکن پھر یاد آیا کہ جدید سائنس نے تسلیم کیا ہے کہ اگر مادہ میں سے خلا نکال دیا جائے تو ساری کائنات کا مادہ چمچ بھر ہوگا۔مادہ اتنا محدود ہو سکتا ہے تو روح تو ویسے ہی لطیف ہے۔سو ضروری نہیں ہے کہ مذہبی عقائد کی حکمت ہم ایک دم ہی سمجھ جائیں۔جہاں کچھ کچھ سمجھ جاتے ہیں، ہماری تسلی ہو جاتی ہے۔جہاں بات پلّے نہیں پڑتی وہاں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے ہیں اور انہیں اپنی دانشوری سمجھ کر خوش ہو لیتے ہیں لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں ہے...عرفات میں مسجد نمرہ کی خاص اہمیت ہے۔اسے صرف حج والے دن کھولا جاتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے اسی مقام پر وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا جسے خطبہ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اور جس کی روح پر نیک نیتی سے عمل درآمد کی صورت میں آج بھی پوری انسانیت کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔اس مسجد کے بند دروازے کے سامنے قبلہ رو ہو کر میں نے اور مبارکہ نے شکرانے کے نفل پڑھے۔یہاں سے ہم جبل الرحمت کی طرف آئے۔یہ ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جسے ہم نے آسانی سے سر کر لیا۔روایت کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے جانے کے بعد عرصہ تک توبہ کرتے رہے۔اس مقام پر رحمت خداوندی نے ان کی توبہ قبول فرمائی اس لیے اسے جبل الرحمت کہتے ہیں۔یہاں ایک چھوٹا سا ستون یادگار کے طور پر بنا ہوا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مقام پر تشریف لے گئے تھے اور وہاں جا کر کھڑے رہے تھے اس لئے وہاں جانا تو سنّتِ رسولؐ کی پیروی کے زمرہ میں بھی آجاتا ہے۔اس کے باوجود پہاڑ کے رستے کے شروع میں ایک بڑا سا بورڈ نصب کر دیا گیا ہے جس میں اس جگہ کو صرف ایک تاریخی مقام قرار دے کر یہاں دعا کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔چلیں یہ صرف ایک تاریخی مقام ہی سہی۔لیکن وہاں دعا کرنے میں کیا قباحت ہے؟ کیا وہاں جا کر خدا سے دعا کی تو اس میں بھی شرک ہو جائے گا۔میں نے اور مبارکہ نے یہاں کھڑے ہو کر دعا کی۔میں نے تو اپنے اب تک کے گناہوں کے علاوہ آئندہ ہونے والے گناہوں کی بھی ایڈوانس میں معافی مانگ لی۔

عرفات سے مزدلفہ کی طرف جاتے ہوئے ایک دیوار سی دکھائی دی۔استفسار پر پتہ چلا کہ خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے جو تاریخی نہر بنوائی تھی، یہ وہی ہے۔اُس زمانے میں دجلہ وفرات سے یہاں مکہ تک حاجیوں کے لئے اور مسافروں کے لئے اتنی شاندار نہر بنوا دینا بہت بڑی بات تھی۔مزدلفہ کے قریب مسجد مشعر الحرام ہے، یہ مسجد صرف حج والی رات کھلتی ہے۔اس کے دروازے کے آگے بھی ہم دونوں نے نفل پڑھے۔یہاں سے آگے بڑھے تو وادیٔ محسّر اور جبل الابابیل نظر آئے۔جبل الابابیل وہ پہاڑ ہے جہاں سے ابابیلوں نے کنکر اٹھائے تھے اور خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے آنے والے یمن کے بادشاہ کے، ہاتھیوں پر سوار عظیم لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔یمن کا بادشاہ ابرہہ مسیحی تھا۔اس نے خانہ کعبہ سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے صنعاء میں ایک عالی شان گرجا تعمیر کرایا تھا۔لیکن جب اس کی شان وشوکت دیکھ کر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے تو وہ خانہ کعبہ ہی کو مٹانے کے لئے چڑھ دوڑا۔ربِ کعبہ نے نہ صرف اپنے گھر کی عظمت کو قائم رکھا بلکہ اس پر حملہ کرنے والوں کو معمولی ابابیلوں کے ذریعے برباد کرا دیا۔خانہ کعبہ کی روحانی عظمت اور شان وشوکت کا یہ عالم ہے کہ سوائے فرض نماز باجماعت کی ادائیگی کے چند منٹوں کے دن رات اس کے گرد عشّاق کا طواف جاری رہتا ہے۔نہ اس تسلسل میں کبھی کوئی تعطّل پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی عشّاق کی تعداد میں کمی ہوتی ہے۔سو دنیا کا کوئی بھی دوسرا مقدس مقام خانہ کعبہ کی اس فضیلت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ہجومِ خلق کے لحاظ سے بھی اور فیوض و برکات کے لحاظ سے بھی صرف ارضِ حرم ہی ارضِ حرم ہے۔

وادیٔ محسّر، جبل الابابیل کے دامن میں ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں یمن کا بادشاہ ابرہہ اپنے ہاتھی سمیت ہلاک ہوگیا تھا اور اس کا سارا لشکر بھی برباد ہوگیا تھا۔ اس جگہ کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہاں خدا کا بہت بڑا عذاب نازل ہوا تھا اس لیے یہاں سے تیزی کے ساتھ گذر جانا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے بھی ٹیکسی کی رفتار کو تیز کیا اور ہم جلد ہی اس وادی سے آگے نکل گئے....اس علاقہ میں ہم نے دور سے پیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا ستون سا دیکھا۔ پتہ چلا یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لئے لٹایا تھا۔ غالباً اسی جگہ مسجد الکبش ہے۔ لیکن اُس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی بلکہ اس طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرنے میں بھی خطرہ تھا۔ دراصل وہیں ساتھ ہی ایک شاہی محل بنالیا گیا ہے اس لئے عوام کا داخلہ اس علاقے میں بھی ممنوعہ ہوگیا ہے۔ حفاظتی اقدامات کے طور پر بے حد طاقتور اور حساس کیمرے نصب کئے گئے ہیں یوں اُس طرف ہماری انگلی کا اشارہ بھی ہمیں مشکوک بنا سکتا تھا۔ سوچُپ چاپ اس مقام سے آگے نکل گئے۔ تھوڑا سا آگے جانے کے بعد مسجد خیف آ گئی۔ یہ منیٰ کی بڑی مسجد ہے۔ حج کے چار دنوں میں اسے کھولا جاتا ہے۔ ایک معروف روایت کے مطابق یہاں ستر ہزار پیغمبرانِ خدا مدفون ہیں۔ میں نے اور مبارکہ نے یہاں بھی مسجد کے بند دروازے کے آگے قبلہ رو ہو کر دو دو نفل شکرانے کے ادا کئے۔

یہاں سے نکل کر ہم سیدھے منیٰ پہنچے جہاں حج کے دنوں میں شیطان کو کنکر مارے جاتے ہیں۔ پتھر کے تین بڑے بڑے ستون تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نصب تھے۔ سائز کے لحاظ سے بھی اور عقیدے کے لحاظ سے بھی ایک بڑا شیطان ہے۔ ایک درمیانہ۔ اور ایک چھوٹا....درمیانے شیطان کی ان دنوں Repairing ہو رہی تھی...شیطان کی Repairing.... بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پتھر تو صرف علامت ہیں، چاہے خیر کی قوت کی علامت ہوں یا شر کی قوت کی...اصل خیر اور شر تو ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔ شیطان بے چارہ تو مفت میں بدنام ہوگیا ہے۔ ہم جو بھی گناہ کرلیں اسی کے سر منڈھ کر خود بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ بس جی شیطان نے بہکا دیا تھا۔۔۔۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے اندر کئی چھوٹے بڑے شیطان بنا رکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی کبھی کمزور ہونے لگے تو ہم خود ہی اس کی Repairing کرنے لگ جاتے ہیں....میں نے منیٰ میں بڑے شیطان کو دیکھتے ہوئے خیال ہی خیال میں اسے کنکریاں ماردیں اور خیال ہی خیال میں دیکھا کہ وہی کنکریاں پلٹ کر مجھے آن لگی ہیں۔ شیطان اس تماشے پر مسکرا رہا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم آج کے انسان۔ روایتی شیطان سے کتنا آگے نکل گئے ہیں۔ اگلے زمانوں میں کسی پر تکبر کا بھوت یا شیطان سوار ہوتا تو وہ براہ راست خدائی کا دعویٰ کر دیتا تھا لیکن آج کا متکبر انسان چالاک ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے کی بجائے خدا کو اپنی مذموم نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک ذریعہ اور بہانہ بنا بیٹھا ہے۔ اپنی انسانی حالت میں ریاکاری کی عاجزی بھی دکھائی اور خدائی کے سارے اختیارات بھی سنبھال لئے۔ یہی تو وہ ذہانت ہے جو نہ فرعون اور نمرود جیسے لوگوں کو نصیب ہوئی نہ شیطان کو ہی سوجھ پائی۔

شیطان سے فارغ ہوئے تو ایک جگہ رُک کر مسجد الکوثر دیکھی۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ کوثر نازل ہوئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہیں اسلام قبول کیا تھا۔ یہاں بہت ہی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی چھت کے بغیر....مسجد الکوثر سے ہم سیدھے جبل نور کی طرف گئے۔ غار حرا اسی پہاڑ پر ہے۔ یہاں بھی چڑھائی کا معاملہ غار ثور جیسا تھا۔ جبل رحمت کی طرح یہاں بھی سعودی حکومت نے ایک بورڈ لگا رکھا تھا کہ غارِ حرا صرف ایک تاریخی مقام ہے۔ اس کی کوئی مقدس اہمیت نہیں ہے۔ قرآن یا حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا وغیرہ وغیرہ۔ مطلب وہی ''موحدانہ'' تھا کہ شرک سے اجتناب کریں۔ جس غار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک لمبے عرصے تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، جہاں قرآن پاک کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ اگر وہ بھی مقدس مقام نہیں ہے تو پھر مقامات مقدّسہ کیا ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟....مفروضہ شرک سے بچنے کے لئے ہی غالباً ''موحد'' سعودی حکومت نے جبل نور کا علاقہ تعمیراتی مقاصد کے لئے فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران عوام الناس تک تو خبریں نہیں پہنچیں لیکن بعض مسلمان حکومتوں نے اندر ہی اندر سعودی حکومت سے نیازمندانہ گذارش کر کے انہیں اس ''موحدانہ عمل'' سے روک لیا تھا۔ تاہم اس کے آس پاس جو تعمیرات ہو چکی تھیں وہ اب بھی موجود ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ غار حرا سلامت موجود ہے۔

غار حرا سے واپسی پر رستے میں بچوں کا ایک پارک دیکھا۔ یہ پارک اس مقام پر ہے جہاں حضرت عمر فاروقؓ نے عدل سے کام لیتے ہوئے اپنے بیٹے کو شرعی سزا دی تھی۔ بیٹا مقررہ کوڑے پورے ہونے سے پہلے ہلاک ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کی لاش پر باقی کوڑوں کی گنتی مکمل کی جائے۔ یوں عدلِ عمر فاروقؓ کی ایک مثال قائم ہوئی۔ اس جگہ کو میدان العدل بھی کہتے ہیں۔ اب یہاں بچوں کا پارک بنا دیا گیا ہے۔ آخر میں حرم شریف کے قریب موجود مسجد الناقہ دیکھی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ وعلیہ وسلم کی اونٹنی بیٹھی تھی اور حضور نے وہیں پڑاؤ کا حکم دے دیا تھا۔ یہیں ابوسفیان نے دس ہزار صحابہ ء کرام کو حضورؐ کی امامت میں نماز پڑھتے دیکھا تھا اور مبہوت رہ گیا تھا کہ جس یتیم اور بظاہر بے آسرا ہستی کو ہم نے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا آج اس کی شان اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کے جھکنے پر دس ہزار افراد ایک ساتھ جھک جاتے ہیں اور اس کے اٹھنے پر ایک ساتھ اٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور پھر حضرت ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ☆☆☆

رباعی: از ناوک حمزہ پوری (انڈیا)

اعجاز دکھائے قم باذنی کی طرح
پا جائے حیات عمر خضری کی طرح

انسان اگر ہو اپنی دُھن کا پکّا
معروف ہو حیدر قریشی کی طرح

یک قلم تحریر۔ آمد از: اجمل جنڈیالوی (پاکستان)

حیدر تمہارے ساتھ ہے اجملؔ کی ہر دعا
حامی خدا کی ذات ہے اور سر پہ مصطفیٰؐ

نسبت ہے تیری حیدرِ کرّار سے حبیب
یاری تمہیں فقیر کی راس آئے گی سدا

ماہیے حیدر قریشی کے لئے

از: امین خیال (پاکستان)

وِدوان قریشی کا
اردو ماہیے پر
احسان قریشی کا

ماہیے کا۔۔۔رب والی
قسمت ماہیے کی
حیدر نے بدل ڈالی

''ماہیے کی کہانی'' ہے
پڑھ کے جو نہ مانے
اُس کی نادانی ہے

چھب، بھَے بھی ہوتی ہے
ماہیے کی اپنی
اک لَے بھی ہوتی ہے

سُر تال میں جچتا ہے
ایک سبب کم ہو
تب ماہیا لگتا ہے

دار جلنگ کی غزل

(حیدر قریشی کی نذر)

عاصم شہنواز شبلی

تماشہ اک دکھانا چاہتا ہے
زمانے کو نچانا چاہتا ہے

عجب قصہ بنانا چاہتا ہے
بدن میں وہ ٹھکانا چاہتا ہے

مجھے وہ یوں بھلانا چاہتا ہے
کہ آنکھوں میں بسانا چاہتا ہے

وہ رازِ دل چھپانا چاہتا ہے
کہ یادوں کو سلانا چاہتا ہے

اسے ہے جستجو ہر لمحہ کس کی
وہ کیا کوئی خزانہ چاہتا ہے

جواب آئے نہ آئے دل ہمارا
کبوتر اک اڑانا چاہتا ہے

مِرے دل کی عجب خواہش ہے عاصمؔ
بدن بس اک پرانا چاہتا ہے

اردو ماہیے کے سرخیل

حیدر قریشی کی خدمت میں نذرِ خلوص

نذیر فتح پوری

فن کے بُت خانے کا آذر حیدر — ڈھالتا رہتا ہے پیکر حیدر

ہے بظاہر تو سخن ور حیدر — اور باطن میں قلندر حیدر

کون سے مول خریدو گے اسے — علم و دانش کا ہے گوہر حیدر

توڑ کر کہنہ روایات کے در — بن گیا وقت کا حیدر۔۔۔حیدر

''دل دریچے'' سے گزر کر آیا — خوشبوؤں سے ہے معطّر حیدر

شاذ ہی جس کے شناور ہوں گے — ایسے فن کا ہے سمندر حیدر

جب بھی دیکھا ہے اندھیرا فن میں — بن گیا ماہِ منوّر حیدر

سیر کرتا ہے فلک کی لیکن — پاؤں رکھتا ہے زمیں پر حیدر

معرکے جیت لئے ہیں سارے — ہے مقدر کا سکندر حیدر

تنہا اترا تھا وہ میدانوں میں — ساتھ اب رکھتا ہے لشکر حیدر

وار سب جان گیا ہے فن کے — مات اب کھائے گا کیونکر حیدر

اب مخاطب کے ہیں وارے نیارے — بن گیا رونقِ منبر حیدر

کون سا مسئلہ سلجھاؤں اب — سوچتا رہتا ہے اکثر حیدر

کھولتا رہتا ہے اسرارِ سخن — لفظ و معنی کا ہے دفتر حیدر

شعر میں کہتا ہے دل کی باتیں — بن گیا درد کا مظہر حیدر

دل سے تخلیقِ سخن کا احساس — دور کرتا نہیں پل بھر حیدر

کہکشاں سے ہے محبت اس کو — شب کے ماتھے کا ہے جھومر حیدر

جب بھی چاہے گا اُٹھا دے گا نذیرؔ — شعر کی دنیا میں محشر حیدر